قصص و مسائل

قرآن مجید سے متعلق دو فاضلانہ مقالات کا مجموعہ

بعد نظر ثانی اضافہ و ترمیم

مولانا عبد الماجد دریابادی

صاحب تفسیر قرآن (انگریزی و اردو) مدیر صدق لکھنؤ

مجلس نشریات اسلام

۱۔ کے ۳، ناظم آباد مینشن، ناظم آباد، کراچی

قصص و مسائل

قرآن مجید سے متعلق دو فاضلانہ مقالات کا مجموعہ

بعد نظر ثانی اضافہ و ترمیم

مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم

صاحب تفسیر قرآن مجید (اردو ۔ انگریزی)

مجلس نشریاتِ اسلام

۱۔ کے ۔ ۳ ۔ ناظم آباد مینشن، برف خانہ ناظم آباد کراچی

کتابت ــ ۔۔ ــ ۔۔ ــ دلشاد احمد

طباعت ــ ۔۔ ــ ۔۔ ــ شکیل پرنٹنگ پریس کراچی

صفحات ــ ۔۔ ــ ۔۔ ــ ۱۲۰

قیمت ــ ۔۔ ــ ۔۔ ــ روپے

ناشر

فضل ربّی ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام

ا۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن، نزد برف خانہ ناظم آباد ۵ کراچی ۱۸

فہرست

نمبر صفحہ

نمبر صفحہ

دیباچہ

(طبع اوّل)

قرآن مجید کی تحریری خدمت کا شغل تو عرصہ سے جاری ہے۔ پچھلے دنوں دو علمی مجلسوں میں کارکنوں کی دعوت پر مقالہ سنانے کا اتفاق ہوا۔

پہلے مقالہ کا عنوان ہے "بعض قدیم مسائل جدید روشنی میں" یہ رضا اکاڈمی (رامپور) کے جلسہ میں ۲۰ دسمبر ۱۹۴۱ء کی شام کو سنایا گیا۔ اکاڈمی مذکور کوئی دینی و مذہبی ادارہ نہیں ایک علمی مجلس ہے۔ اس کے اندر گفتگو صرف قرآن مجید کے علمی، اثری، جغرافیائی، تاریخی پہلوؤں پر ممکن تھی۔ آج وہ مقالہ بہت سے اضافوں اور ترمیمات کے بعد رسالہ کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

دوسرے مقالہ کا عنوان ہے "جدید قصص الانبیاء" یہ اسلامیہ کالج پشاور کی مجلس اسلامیات کے جلسہ خصوصی میں ۱۸ جنوری ۱۹۴۲ء کی صبح کو سنایا گیا اور آج خفیف سی تصحیح و ترمیم کے بعد تقریباً بعینہٖ شائع ہو رہا ہے۔

دونوں مقالے قسط وار صدق (لکھنؤ) میں نکل چکے ہیں۔ ان کے

مجموعہ کا نام "قصص و مسائل" تجویز ہوا ہے اور یہ پہلا ایڈیشن ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن کو دیا جارہا ہے۔

دونوں مقالے بعض مخلصین کے صدق طلب ہی کا ثمرہ ہیں۔ پہلا مقالہ اکاڈمی کے خوش ذوق صدر مولوی معین الدین صاحب لکھنوی بی اے بیرسٹر ایٹ لا، جج ہائی کورٹ (رامپور) اور خادم علم سکریٹری مولوی امتیاز علی صاحب عرشی (مہتمم کتاب خانہ ریاست) کی تحریک پر تیار ہوا تھا اور دوسرا مجلس اسلامیات کے پرجوش صدر مولانا نورالحق صاحب ندوی (ناظم دینیات کالج) اور ہونہار سکریٹری محمد اسحاق صاحب کی دعوت پر۔

اِن احباب کی محبت کا شکریہ ضروری ہے۔

خداوند کریم اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے اور رسالہ کو دینی اور علمی دونوں حیثیتوں سے نافع بنائے۔

دریاباد ضلع بارہ بنکی
جنوری ۱۹۴۴ء

عبدالماجد

دیباچہ
(طبع دوم)

یہ دو مقالے آج سے کوئی ۱۲ سال قبل یکجا کتابی صورت میں اوّل بار شائع ہوئے تھے۔ اب انھیں کو نظر ثانی، ترمیم اور خفیف اضافہ کے بعد از سرِ نو شائع کیا جارہا ہے۔ نظر ثانی اور ترمیم عموماً لفظ و عبارت میں ہوئی ہے، اور خفیف سا اضافہ مغز و مضمون میں۔

قرآن مجید کی خدمت علاوہ خالص دینی، فقہی، کلامی، ادبی پہلوؤں کے علمی اثری و تاریخی حیثیت سے بھی بڑی گنجائش رکھتی ہے۔ یہ رسالہ اس منزل کی طرف ایک حقیر سا قدم ہے اور اس نامہ سیاہ کے قلم سے دو رسالے حیوانات قرآنی اور جغرافیہ قرآنی کے نام سے اس سے قبل بھی اسی سلسلہ میں نکل چکے ہیں۔ ان کا مخاطب اصلاً اور براہ راست جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ اللہ انھیں نافع و مقبول بنائے۔

تفسیر ماجدی انگریزی اور اُردو دونوں بحمداللہ مکمل ہوئے کئی سال ہو چکے

ہیں۔ دونوں کے پہلے ایڈیشن تاج کمپنی (لاہور و کراچی) کو دئے ہوئے ایک مدت ہو چکی۔ کمپنی مذکور نے انگریزی تفسیر کے صرف دو پارے اس وقت تک شائع کئے ہیں اور اُردو تفسیر کی دو جلدیں۔ یعنی ختم سورۃ البرأۃ تک۔ اور تیسری اور چوتھی جلدیں عجب نہیں کہ اِن سطور کے شائع ہوتے تک پریس سے باہر آجائیں۔ ان تفسیروں میں بھی مضامین، اس رسالہ سے ملتے ہوئے بہ کثرت ملیں گے۔

دریاباد۔ بارہ بنکی (ہند)
مارچ ۱۹۵۶ء

عبدالماجد

بعض قدیم مسائل

جدید روشنی میں

قرآن مجید اور علوم حاضرہ

قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دنیا کی ایک اہم ترین علمی کتاب بھی۔ مطالعے کے قابل مسلم کے لئے بھی، غیر مسلم کے لئے بھی۔ ان تیس پاروں کی ضخامت کے اندر اللہ اکبر کیا کچھ بھرا ہوا ہے۔ توحید و رسالت کے عقیدے ہیں، روح و جزائے عمل کے مسئلے ہیں، فقہ و قانون کی دفعات ہیں، معاشرت و اخلاق کی تعلیمات ہیں، سیاسیات کے ضابطے ہیں، معاشیات کے قاعدے ہیں، اگلوں کی حکایتیں ہیں، پچھلوں کے لئے ہدایتیں ہیں، اشخاص کے تذکرے ہیں، عمل و کردار پر تبصرے ہیں ——— ایک بے علم و ہیچمدان، خدمت قرآن میں اپنی بساط کے لائق کئی سال سے لگا لپٹا ہوا جب ایسی آیتوں پر پہنچا جن کا تعلق نظر آیا اسی دنیا کے گزرے ہوئے واقعات سے، اسی کائنات کے اشخاص و مقامات سے، تو طبیعت میں کرید قدرۃً یہ پیدا ہوئی کہ یہ تذکرہ کب کا

ہے؟ کہاں کا ہے؟ یہ شخص کون ہے یہ قوم کون سی ہوئی ہے؟ یہ واقعہ جو پیش آیا، کس کیفیت کے ساتھ پیش آیا؟ تاریخ اپنی روشنی کی کوئی کرن ان واقعات پر ڈالتی ہے؟ جغرافیہ کوئی پتہ نشان ان مقامات کا اپنے نقشہ پر بتاتی ہے؟۔ سوالات کے جوابات جو ملے ان کا ایک مختصر سا حصہ اس مجلس علمی کے روبرو پیش ہو رہا ہے۔ مقالہ کسی محقق کا اپنے ہمسروں اور ہم عصروں کے سامنے نہیں آموختہ ایک ادنیٰ طالب علم کا ہے اہل علم کے سامنے، وہ بھی کچھ کچا کچھ پکا۔

بنی اسرائیل کی کائناتی اہمیت

قرآن کا خطاب دنیا کی ساری قوموں سے ہے لیکن ذکر ایک خاص قوم کا اور ذکر بھی اس پر الطاف خداوندی کی بارش کا، اس تفصیل اور تکرار کے ساتھ آتا ہے کہ گویا وہ قوم جوہر ہے، دوسری قومیں عرض۔ وہ ایک اصل ہے اور باقی سب شاخیں۔ وہ ایک مقصود ہے اور دوسری قومیں طفیلی۔

یہاں تک کہ اس قوم کو مخاطب کر کے صاف صاف ارشاد ہو گیا ہے کہ اِنّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ ۔ میں نے تمھیں دنیا جہاں والوں پر فضیلت دے رکھی تھی، نام اس قوم کا بنی اسرائیل ــــ ذوقِ تاریخ نے کان کھڑے کئے طبیعت کے کھوج نے سوال کیا کہ دعویٰ پر کوئی مادی دلیل؟ حاسۂ تجسس نے بیدار ہو کر پوچھا کہ بیان کا کوئی حسّی ثبوت؟

آثار قدیمہ کے راوی کا بیان ہے کہ اسرائیل لقب ہے یعقوب بن اسحٰق کا۔ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہوئے ہیں۔ اسلامی عقیدہ میں بھی، مسیحی

عقیدہ میں بھی، اور یہودی عقیدہ میں بھی۔ نام عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ لغوی معنی ہیں۔ خدا کے بندے یا خدا کے پہلوان کے۔ پوتے تھے حضرت ابراہیم پیغمبرؑ کے۔ سال پیدائش ۲۰۰۰ ق-م ہے۔ یعنی آج سے ۳۹۴۱ سال قبل[1] وطن فلسطین یا قدیم بولی میں کنعان جو اُس وقت ملک شام کا ایک سرسبز صوبہ تھا۔ دو بیاہتا بیویاں تھیں اور دو شرعی باندیاں۔ اِن چاروں سے اولاد کل ملا کر بارہ بیٹے ہوئے ان سے جو عظیم الشان نسل چلی وہ تیزی کے ساتھ پھیلی اور بڑھی۔ اسی کا نام بنی اسرائیل پڑا۔ دنیا کے اتار چڑھاؤ جس طرح سب دیکھتے ہیں ان لوگوں نے بھی اپنی تاریخ میں دیکھے۔ کبھی گرے کبھی ابھرے۔ آج جیتے کل ہارے۔ ابھی حکومت کی، ابھی حکومت سہی۔ اس حیثیت سے ان کی تاریخ ویسی ہی ہے جیسی دنیا کی اور ساری قوموں کی اور اس معنی میں انھیں کوئی خاص افضلیت کسی دوسری قوم پر نہیں۔ لیکن عروج و زوال کے سارے چکروں کے باوجود ایک چیز اُن کی ہمیشہ قائم رہی۔ نبوّت کی شمع جو اُن کے خاندان میں ایک بار جل چکی تھی بجھی نہیں برابر روشن رہی۔ نبی اُن کے ہاں مسلسل پیدا ہوتے رہے۔ افراد انبیاء کے مقابلہ میں عداوتیں، بغاوتیں، انھوں نے برابر برتیں۔ آج اس نبی کو جان سے مار ڈالا، کل اس نبی کو وطن سے نکال دیا۔ لیکن نفس نبوت کے قائل برابر بنے رہے۔ عمل میں باغی، طاغی غدار کیسے ہی ثابت ہوئے ہوں لیکن عقیدہ میں مسئلہ نبوت کے منکر نہ ہوئے۔

---

[1] اب ۱۹۵۲ء میں ۳۹۵۲ سال قبل

افضلیت کا معیار :

معاصر قومیں، ترقی کرنے والی قومیں، دولت و حکومت والی قومیں متمدن پڑھی لکھی قومیں مصر میں بھی تھیں اور ہندوستان میں بھی، عراق میں بھی اور ایران میں بھی، ان کے کان رسول کے پیام اور نبی کے کلام سے ناآشنا رہے۔ ان کے ہاں "اوتار" آتے رہے، مظہر خدا پیدا ہوتے رہے۔ یعنی خالق کائنات خود کسی نہ کسی قالب میں ظاہر ہوتا رہا۔ کسی مخلوق کے جسم کے اندر حلول کرتا رہا لیکن اس ساری مدت میں یہی ایک قوم اسرائیل ایسی رہی جس میں نبی پر نبی اور رسول پر رسول آتے رہے۔ محض پیامبر تھے کسی بالا و برتر کا پیام لاتے رہے، کسی قوی و قادر کا کلام سناتے رہے ــــ جو وسیع ہو زمین کی ساری وسعتوں سے، بلند تر آسمان کی ساری رفعتوں سے منزہ ہو جسم سے، جان سے، مکان سے، اس کے لئے یہ ممکن ہی کیوں کر ہو کہ وہ اپنے کو قالبوں میں منتقل کرتا رہے! ــــ یہی راز ہے اس کا کہ یہی ایک قوم بحیثیت قوم جمی رہی عقیدۂ توحید پر، او رپچی رہی مظاہر پرستی سے، عناصر پرستی سے صنم پرستی سے، حجر پرستی سے، بخلاف مصر و کلدانیہ، ایران و ہندوستان اور آخر میں یونان کے۔ جغرافی حیثیت سے ان سب کے درمیان، انھیں سے گھری ہوئی لیکن عقائد میں ان سب سے الگ تھلگ، یہی ایک قوم ایسی رہی جو کلمہ پڑھتی رہی خالق کی تنزیہ و تقدیس کا۔ اس حال میں کہ ہمعصر قومیں تشبیہ و تجسیم کی بھول بھلیاں میں اپنے کو گم کرتی گئیں توحید کا جھنڈا اسی کے ہاتھ میں بلند رہا۔ تنزیہ اور توحید کا ہے بھی چولی دامن کا ساتھ۔

بس یہی خصوصیت نسل اسرائیل کی وہ ہے جس نے اسے شرف و امتیاز دے رکھا ہے تمام دوسری نسلوں پر، نسل انسانی کے سارے دوسرے کنبوں خاندانوں پر۔ قرآن نے اسی کو تعبیر کیا ہے اقوام عالم پر افضلیت سے۔ قرآنی معیار افضلیت اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟ فلسفہ و حکمت، شعر و ادب صنعت و حرفت، مال و دولت، حکومت و تجارت کے سکے اور جس اقلیم و مملکت میں بھی رواں ہوں، قرآن کا معیار بزرگی تو یہی توحید کی دولت ہے اور ایمان باللہ کی نعمت۔ کیا مضائقہ اگر اس قوم کی تاریخ کے صفحات خالی ہیں۔ ارجن اور بھیم کے ترانوں سے، ارسطو اور افلاطون کے افسانوں سے ہومر اور کالیداس کی بساط بزم سے اور دارا اور سکندر کے میدان رزم سے قرآن کی نظر میں تو قدر موسیٰؑ و ہارونؑ داؤدؑ و سلیمانؑ، الیاسؑ و زکریاؑ یحییٰؑ و عیسیٰؑ کی ہے۔

قوم و امت کا فرق :

ابھی گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل نام ہے ایک خاص خاندان کا۔ حافظہ میں پھر ایک بار اس حقیقت کو تازہ کر لیجیے کہ بنی اسرائیل نام کسی مذہب و دین کا نہیں، کسی عقیدہ و آئین کا نہیں، نام ہے ایک مخصوص نسل کا۔ اس لیے امت محمدی اور قوم اسرائیل کے درمیان تقابل و تفاضل کا کوئی سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اور قرآن کے جن طلبہ نے ان بحثوں کو چھیڑ دیا ہے، وہ بیچارے خلط کر گئے نسل اور دین کے درمیان۔ اور اُن کے ذہن سے یہ

حقیقت یکسر نظر انداز ہو گئی کہ امت محمدیؐ کے فضائل جو کچھ بھی ہیں وہ افراد کے اختیار کئے ہوئے دین، عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے ہیں۔ نہ کہ افراد کی غیر اختیاری نسلیت و قومیت کی بنا پر۔

اب ایک نظر اس پر بھی کر لیجئے کہ قرآن میں ذکر بنی اسرائیل کا شروع کس موقع پر ہوتا ہے۔ پارۂ اوّل کے سب سے پہلے رکوع میں مذکور ہے کہ انسانیت کی تقسیم خدا کے ہاں صرف دو گروہوں میں ہے۔ ایک گروہ ہے اطاعت شعاروں کا، وفاداروں کا، ایمان والوں کا۔ دوسرا ہے باغیوں کا، طاغیوں کا، منکروں کا۔ دوسرے رکوع کا مضمون یہ ہے کہ نوع انسان کا ایک تیسرا گروہ بھی ہے زبان سے وفادار اور دل سے غدّار ہیں۔ یہ لوگ بالکل باغی اور منکر لیکن دھوکا دینے کے لیے وردی وفاداروں کی پہن لی ہے۔ گویا حق کے قبول و رد کے معیار سے کوئی تیسری تقسیم ممکن ہی نہیں۔ قسمیں کل وہی دو ہیں۔

اب تیسرے رکوع میں قرآن اپنی اصل دعوت، یعنی پیام توحید و رسالت کو پیش کرتا ہے اور مخاطب سارے عالم انسانی کو بہ حیثیت مجموعی کرتا ہے۔ چوتھے رکوع میں بیان ہے انسانیت کی تاریخ کا۔ یعنی انسان کو پیدا کیا گیا فلاں خاص طریقہ پر، فلاں خاص مقصد کے لیے۔ اب آگے قرآن کو یہ مضمون لانا ہے کہ نسل انسانی میں سے ایک خاص خاندان اس دعوت کے لئے چن لیا گیا دنیا میں اس پیام کی منادی اسی مخصوص قوم کے ذریعہ سے کی گئی۔ قرن پر قرن اور صدیوں پر صدیاں گزرتی گئیں اور وہ مخصوص قوم اپنی مسلسل نافرمانیوں سے اپنی پیہم عہد شکنیوں سے اپنے کو اس نعمت کا نا اہل ثابت کرتی گئی، مواقع پر مواقع ملتے رہے اور ہر نئی مہلت مزید سرکشی ہی پر ختم ہوتی رہی اس لئے اب نظام نو میں وہ نعمت، اس مخصوص نسل سے چھین کر ایک دوسری نسل کے پیامبر کے واسطہ سے ساری دنیا کے لئے بلا امتیاز نسل و قوم عام کی جا رہی ہے۔ اب ایک عالم گیر ہادی ساری دنیا کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ یہ وہ پیامبر ہے جس کے بعد کوئی پیام نہ آئے گا۔ آئندہ اعتبار صرف افراد کے عقائد و اعمال اختیاری کا کیا جائے گا۔ کوئی اسرائیلی ہو، اسمٰعیلی ہو، آریائی ہو، تاتاری ہو، غرض کسی نسل کا بھی ہو، جو بھی صحیح راہ اختیار کر لے گا، بس نجات اسی کی ہے۔ اس سارے مفہوم کے شروع کر دینے کے لئے بہترین جگہ کون سی ہو سکتی تھی؟ یقیناً وہی جہاں خلقت انسانی اور مقصد آفرینش کا بیان ختم ہوا ہے ـــ یہیں سے یہ ہے کہ خلقتِ انسانی اور مقصدِ آفرینش کے معاً بعد اِدھر چوتھا رکوع ختم ہوا، ادھر پانچویں رکوع کے ساتھ اس مخصوص انعام یافتہ نسل بنی اسرائیل کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور پھر بہت دور تک سلسلہ انکی شرارت و سرکشی کا چلا جاتا ہے ـــ ترتیب، مقتضائے حال کے عین مطابق اور بیان، حُسن بیان کے ہر تقاضہ کو پورا کرنے والا۔

ایک اہم نکتہ:

آگے چل کر قرآن میں ذکر "یہود" کا آتا ہے اور بار بار آتا ہے۔ اور بنی اسرائیل کا تذکرہ بھی موقوف نہیں ہوا ہے، وہ بھی برابر آئے جاتا ہے تو کیا ایک ہی مفہوم کے لئے قرآن دو لفظ ادل بدل کر لا رہا ہے؟ کبھی یہ نام لے دیا، کبھی وہ، لیکن ایسے بلیغ اور پُر حکمت کلام سے یہ ہے بہت بعید۔ قرآن

تو کوئی لفظ بیکار لاتا ہی نہیں۔ پھر یہ کیا ہے؟ ہے یہ کہ اِن دونوں لفظوں کے مفہوم بالکل الگ الگ ہیں۔ "بنی اسرائیل" نام ہے ایک مخصوص نسل کا۔ ایک متعین قبیلہ کا۔ اس کی ایک تاریخ ہے۔ اس کا ایک ماضی رہ چکا ہے۔ "یہود" اس کے برعکس نام ہے ایک مذہبی فرقہ کا، ایک دینی امّت کا۔ اُس کے کچھ مخصوص عقائد ہیں، اس کا ایک مخصوص مسلک ہے۔ اب سیاق کلام جہاں جہاں تاریخی ہے، قومی ہے، مقصود ان کے نسلی کارناموں کو یاد دلا کر انھیں شرم دلانا ان پر حجّت قائم کرنا ہے۔ عرب نسل اور بنی اسمٰعیل کے ساتھ اُنکے حسد و تعصب کا ذکر کرنا ہے۔ ایسے کل موقعوں پر نام بنی اسرائیل کا آیا ہے برخلاف اس کے سیاق جہاں جہاں مذہبی ہے مقصود ان کے باطل عقائد کی پردہ دری ہے، اشتراک ان کا نصاریٰ کے ساتھ دکھایا ہے تقابل ان کا مشرکین سے، مومنین سے، غرض کسی مذہبی فرقہ کے ساتھ کیا گیا ہے، ایسے ہر موقعہ پر نام یہود کا لیا گیا ہے! ــــ شروع سے آخر تک قرآن کی آیتوں کا استقصار کر جائیے، ہر جگہ یہی التزام نظر آئے گا۔

اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا کی تفسیر

اور سنیے سارے قرآن میں کہیں کہیں یعنی کوئی آٹھ دس جگہ بجائے اسم الیہود کے ایک فقرہ اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا آیا ہے، یعنی وہ لوگ، جو یہودی بن گئے جنھوں نے یہودیت اختیار کر لی۔ پھر وہی سوال کہ ایک مفہوم کے لئے دو لفظ کیسے؟ ــــ پھر وہی جواب کہ دونوں کا بعینہ ایک مفہوم ہی نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ یہودی مذہب، مسیحیت اور اسلام کی طرح

تبلیغی مذہب نہیں بلکہ ہندومت کی طرح نسلی مذہب ہے۔ نسل اسرائیل نے اپنے لئے جو قومی مذہب اختیار کیا۔ بس اسی کا نام یہودیت پڑ گیا۔ اب ہوا یہ کہ گرد و پیش بہت سے لوگ نسلاً اسرائیلی نہ تھے، اس لئے باقاعدہ یہودی تو ہو ہی نہیں سکتے تھے لیکن یہود کا زمانہ اقبال کا تھا اور اقبال کا اثر پڑوسیوں پر پڑنا لازمی تھا۔ یہود کے فنون اور صنعتوں سے، اُن کی آسمانی کتابوں کے علوم اور حکمتوں سے، اور خود اُن کی دولت و امارت کی چمک دمک سے اِن ہمسایہ قوموں کی نظریں ایسی خیرہ ہوئیں کہ انھوں نے بے اختیار طور طریقے، تہذیب و معاشرت، زبان و تمدن، یہاں تک کہ عقائد و اعمال بھی انھیں کے اختیار کر لئے، اور رفتہ رفتہ یہودیت کے اندر جذب ہو گئے، گم ہو گئے، جیسے آج سے کچھ روز پیشتر ہندوستان میں انگریزوں کے دور اقبال میں سیکڑوں ہندوستانی دیکھتے دیکھتے "صاحب بہادر" بن جاتے تھے یا پھر خود بعض فرنگیوں اور فرنگنوں کی مثالیں بھی اسی ہندوستان میں ملیں گی کہ ہندو مذہب اور ہندو رسم و رواج ایسے پسند آئے کہ سناتن دھرم باضابط قبول کئے بغیر انھوں نے بولنا چالنا، کھانا پینا، رہنا سہنا، سب طور طریقہ ہندوؤں کے اختیار کر لئے اور عملاً بالکل ہندو ہو گئے، یہود کے عروج و اقبال کے زمانے میں قبیلے کے قبیلے اُن کے ہمسایوں کے ایسے تھے جو اسی طرز پر رفتہ رفتہ یہودیت میں داخل ہو گئے تھے۔ یا یوں کہیے کہ یہودیت ان کے اندر سرایت کر گئی تھی۔ حجاز کے شمال میں، نیز وسط میں ایسے عرب قبیلے متعدد تھے جو اپنی عربیت چھوڑ، بے تکلف یہودیت میں غرق ہو گئے تھے۔

قرآن نے لحاظ اس نازک فرق کا بھی رکھا اور جہاں کہیں موقع اس قسم کے لوگوں کی تذکیر یا تنبیہ کا ہوا، وہاں بجائے الیھود کے الَّذِیْنَ هَادُوْا ہی استعمال کیا۔

"نصاریٰ" کی تحقیق

یہود کے علاوہ ایک دوسرے مذہبی فرقہ کا نام بھی قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے اور وہ "نصاریٰ" ہے۔ اکثر انگریز مترجمین قرآن نے (اور ان میں بعض بڑے مشہور فاضل بھی ہیں) بے تکلف اس کا ترجمہ انگریزی میں Christians سے کر دیا اور اُردو میں بھی نصرانی کو مسیحی کا مرادف سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ اگر قرآن کو ذکر "مسیحیوں" کا کرنا ہوتا تو خود یہی لفظ وہ کیوں نہ لے آتا اسے چھوڑ خواہ مخواہ دوسرا لفظ کیوں تلاش کرتا؟ اصل یہ ہے کہ جس اُمت یا مسلک کا نام مسیحیت چل پڑا ہے، وہ مذہب نہ حضرت مسیحؑ کا ہے، نہ اور کسی نبی برحق کا۔ حضرت مسیحؑ کے ساتھ اس کی نسبت تو محض نام کی ہے۔ یہ مذہب چلایا ہوا پال یا پولوس طرطوسی کا ہے اور اس کو حضرت مسیحؑ کی صحبت یا حواریت الگ رہی، زیارت بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ قرآن نے اس مذہب کا کوئی مرتبہ تسلیم نہیں کیا بلکہ جہاں ذکر تثلیث پرستوں کا لانا منظور رہا ہے، وہاں عام کافروں کی طرح ان کے حق میں بھی کفر محض کی صراحت کر دی ہے۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ یا لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وغیرہا۔ بہ خلاف اس کے اس نے نصرانیت کی ایک خاص حیثیت مثل یہودیت کے اور اس کی ہم سطح تسلیم کی ہے۔ بلکہ ایک جگہ تو

نصاریٰ کی گویا مدح بھی کی ہے اور انھیں یہود اور مشرکین دونوں پر علانیہ ترجیح دی ہے۔ "نصاریٰ" سے اس کی مراد حضرت مسیحؑ کو ابن اللہ نہیں، نبی ماننے والا وہ قدیم فرقہ ہے جو ابتدائی چند صدیوں تک موجود رہا۔ انگریزی میں ان کو Nazarenes کہتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کا وطن تھا قصبہ ناصرہ ملک شام کے ضلع ارض جلیل کا انگریزی تلفظ Nazareth ہے۔ اسی وطن کی نسبت سے حضرت مسیحؑ بھی یسوع ناصری مشہور ہوئے، جیسے آج قادیان کی نسبت سے مرزائے قادیانی۔ اور جس طرح آج مرزائے قادیانی کے ماننے والوں کا لقب بھی قادیانی پڑ گیا ہے، حضرت یسوع ناصری کے بھی ماننے والے شروع شروع میں نصرانی ہی کہلائے۔

اصلی انجیل پر روشنی:

یہ فرقہ ایک خاصی حد تک حضرت مسیحؑ کی تعلیمات پر قائم رہا اور شرک سے تو بہرحال محفوظ رہا۔ اس نے مسیحؑ کو مسیح اور نبی ہی مانا، نہ خدائی میں بقدر ⅓ شریک کیا اور نہ خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا۔ یہ فرقہ شام و اطراف شام میں تیسری صدی عیسوی تک اپنے اسی نام سے زندہ رہا۔ پھر اسے مخالفین حقارت سے ابیونیہ Ebionites کہنے لگے۔ (عبرانی میں اس کے معنی مفلس و نادار کے ہیں) مسیحی تاریخوں میں آتا ہے کہ کوئی دو صدیوں تک اور زندہ رہنے کے بعد یہ فرقہ بہ حیثیت ایک مستقل فرقہ کے گم ہو گیا۔ یہ بھی لکھا ہوا موجود ہے کہ موجودہ مروج انجیلوں کے علاوہ کوئی انجیل یونانی و لاطینی میں ترجمہ کی ہوئی نہیں بلکہ اپنی

انگلستان کسی کو ہندوستان کا وائسرائے بنا کر بھیجیں اور پھر یہ بھی اعلان کرنے لگیں کہ وہ باغیوں اور غداروں میں نہیں! —— تو کیا قرآن نے حشو بھی اپنے اندر جائز رکھا ہے ؟

اس منزل پر پہنچ کر اس حقیقت کو یاد کر لیجئے کہ قرآن سے قبل دو اور قومیں نبوت کا کلمہ پڑھتی ہوئی اس دنیا میں آباد ہوئی تھیں اور اس وقت تک آباد تھیں۔ ایک یہودی دوسرے نصرانی۔ ان دونوں نے ایک طرف تو سلیمان بن داؤد کا شمار انبیاء میں کیا۔ ان کے نام کے صحیفہ کو اپنے صحائف آسمانی کے مجموعہ میں جگہ دی اور دوسری طرف ان کی بدکرداری اور فسق کا ڈھول اس زور سے پیٹا کہ انھیں دائرۂ ایمان و حلقۂ توحید ہی سے خارج کر دیا اور آج تک خارج کئے ہوئے ہیں۔

یہود کی ایک تازہ مستند کتاب ویلنٹائن کی یک جلدی جیوش انسائیکلو پیڈیا Valentine-s-one-volume-jewish Encyclopedia میں ہے۔

"سلیمان نے حکمرانی ایک مشرقی فرماں روا کی شان و شوکت سے کی اور انھیں کمزوریوں کے ساتھ بھی۔ یعنی عورتوں سے عشق، عالیشان عمارتیں اور پر تعیش طرز معاشرت یہی چیزیں آخر تباہی لائیں۔ پھر پر تعیش زندگی کے لئے ٹیکس بھی بھاری بھاری لگانے پڑے"۔ (ص ۶۱)

دوسری بارہ جلدوں والی ضخیم جیوش انسائیکلو پیڈیا میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے اور اسرائیلیوں کے بڑے قدیم مؤرخ جوزیفس نے تو فسق و فجور

ہی کو نہیں، صاف صاف ارتداد، شرک و بت پرستی کو آپ کی جانب منسوب کر دیا ہے۔

رہے مسیحی، تو ان کے کلیسا میں مدتوں زور و شور سے بحث اس مسئلہ پر جاری رہی کہ سلیمان کی مغفرت ہو گی یا نہیں؟ اور سینٹ آگسٹائین اور بہت سے آبائے کلیسا نے سوال کا جواب نفی ہی میں دیا! (ملاحظہ ہو ہیسٹنگز کی "ڈکشنری آف دی بائبل" جلد ۴۔ ص ۵۶۷ حاشیہ۔) اور رومن کیتھولک گروہ کی مستند کتاب کیتھولک ڈکشنری میں آج تک یہ لکھا چلا آ رہا ہے کہ (مسلمان ناظرین اس "نقل کفر" کو معاف فرمائیں)

"اس کی عیاشی اور غیر کفو بیویوں کی رضا جوئی نے بت پرستی تک اس کی نوبت پہنچا دی۔ گو بعض کا خیال ہے کہ اسے آخر وقت توبہ نصیب ہو گئی تھی"۔ (ص ۹۱۲)

اور یہ فتوے ان مشائخ یہود و آبائے کلیسا کے کچھ طبع زاد نہ تھے جن نوشتوں کو یہ صحائف آسمانی قرار دیئے ہوئے ہیں۔ ان تک میں یہ تصریحات موجود ہیں۔

"جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔ اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا"۔ "سو از بسکہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے، پر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا"۔ (۱۔ سلاطین ۱۱: ۹ و ۱۰)

چلے جاتے، اوراس کے بعد اپنے داہنے ہاتھ کو، یعنی مشرق کی طرف مڑتے، اور اس طرح خشکی ہی خشکی فلسطین پہنچ جاتے، یہ پہلے ہی سے مشرق کی طرف مڑ گئے۔ اب سامنے سمندر تھا۔ سمندر سے مراد دریائے نیل نہیں، جو اسرائیلی آبادی کے علاقے جاشان Goschen سے مشرق نہیں مغرب میں تھا بلکہ مراد ہے بحر قلزم یا اور زیادہ صحیح پتہ جاننا چاہئے، تو بحر قلزم کے شمالی سرے کا وہ مغربی دوشاخہ جس کے بعد اب نہر سوئز شروع ہو جاتی ہے اور اس وقت خشکی تھی۔

فرعون کی غرقابی :

یہاں پہونچے ہی تھے کہ پیچھے سے شاہی فوج کے دستوں نے آلیا۔ مصریوں کا لشکر جرار موجود اور ہزامپیریل مجسٹی فرعون مصر بہ نفس نفیس اس کے کماندار۔ گھوڑوں کے فوجی رتھ اور خود گھوڑے اس وقت کے خاص جنگی سامان تھے۔ یہ سب حاضر، اعداد ان کے توریت میں دئے ہوئے ہیں۔ اسرائیلی اسی حیص وبیص میں تھے کہ اب کیا کریں اور کہاں اپنے کو چھپائیں کہ اشارہ غیبی پا، ان کے رہبر اور خدا کے پیغمبر حضرت موسیٰؑ نے بے تکلیف قدم سمندر میں ڈال دیا اور آپ کے نقش قدم پر آپ کی ساری قوم بھی ہولی۔ سمندر نے راستہ دیدیا۔ پانی پھٹ کر بیچ میں خشکی ہو گئی۔ اب بھی زلزلہ کے اثر سے دریا کا پانی کئی کئی منٹ بالکل غائب ہو جاتا ہے، بہرحال بحری زلزلہ ہو یا کوئی اور سبب اس سے بھی خفی تر، مسبب الاسباب کی تائید غیبی سے قوم اسرائیل سمندر پار کر گئی لیکن جب اس کی تقلید فرعونیوں نے کرنی چاہی، تو

وہی پانی کی کھڑی ہوئی دیواریں پھر آپس میں مل گئیں، اور جس طرح پچھلی جنگ عظیم میں مشہور جہاز ٹائینک Talanic باوجود ہر تدبیر واحتیاط کے غرقابی سے نہ بچ سکا تھا۔ فرعون اور فرعونیت کا سفینہ بھی ڈوب کر رہا۔

من وسلویٰ کا نزول :

فلسطین ابھی دور تھا لیکن اسرائیلی اب جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ چکے تھے، یہ وہ علاقہ ہے جو ملک عرب اور بحر روم اور مصر اور فلسطین کے چوراہے پر واقع ہے اور اسرائیلی اسی علاقہ میں سالہا سال اپنے خیمے ڈیرے لئے ہوئے آج یہاں کل وہاں، خانہ بدوش اور بدویانہ تمدن کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ اس نیم تمدن زندگی میں کھانے پینے کے سارے انتظامات کہاں ممکن تھے؛ حالانکہ مصر میں رہ کر یہ خوگر انھیں کے ہو چکے تھے لیکن قدرت کے انتظامات ہر بشری تدبیر پر غالب اور ہر انسانی عقل سے ماوراہی ہوتے ہیں۔ اس علاقہ کا ایک خاص پرندہ بٹیر ہے، بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے، گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آتا ہے۔ اڑتا اونچا نہیں، بہت نیچا رہتا ہے۔ زیادہ اڑنے کا دم بھی نہیں رکھتا، تھک کر جلد نیچے گر جاتا ہے۔ غرض شکار کر لینا اس کا ہر حیثیت سے آسان۔ شمالی سفر اس کا مصر سے فلسطین کی طرف عموماً مارچ میں ہوتا ہے، اور جنوبی سفر فلسطین سے مصر کی طرف عموماً نومبر میں۔ عربی میں اسی جانور کو سلویٰ کہتے ہیں۔ اسرائیلیوں کو یہ نعمت گھر بیٹھے ملنے لگی۔ نہ طویل سفر کی دقتیں، نہ سامان شکار تیار کرنے

کی زحمتیں آرام سے اپنے پڑاؤ میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ بٹیر آ کر خود بخود گرنے لگے اور یہ لگے انھیں پکڑنے اور بھون بھون کر ان کے کباب بنانے۔ مارچ اپریل میں اپنی شمالی پرواز پر رات کے وقت ہوتے تھے۔ سمندر کی تیز ہواؤں کے تھپیڑے انھیں بآسانی اسرائیلی کیمپ تک پہنچا دیتے۔ گوشت خوب چربی دار ہوتا اسلئے رکھنے سے جلد خراب ہو جاتا، تازہ ہی کھانے کے قابل ہوتا۔ اس لذیذ سالن کے ساتھ ساتھ ایک اور انتظام بھی ان کے لئے قدرت کے مطبخ سے ایک خاص قسم کی روٹیوں کا ہو گیا۔ ایک چیز ہوتی ہے مَن۔ یہی نام عربی میں بھی ہے اور یہی اسرائیلیوں کی زبان میں بھی۔ سفید سفید دیکھنے میں گوند کی سی لیکن مزے میں لطیف و لذیذ۔ رات کو اوس کے بعد یہ درختوں پر گرتی اور صبح کو توں پر اس کی ٹکیاں جمی جمائی کھانے کو مل جاتیں ——— یہ چیز بالکل نایاب اب بھی نہیں ہوئی ہے۔ ان علاقوں میں کچھ نہ کچھ اَب بھی مل جاتی ہے۔

بارہ چشمے:

سینا کا علاقہ زیادہ متمدن اور سرسبز تو کبھی بھی نہ تھا لیکن بعض خطے تو بالکل ہی بے آب و گیاہ تھے، خشک بعض چلتے چلتے ایک بار قیام ایک ایسی منزل پر ہوا جہاں کھانا تو کھانا، پانی تک نظر نہ آیا۔ پیاس کی شدت جیسی ہوئی ہو گی ظاہر ہے۔ نام اس مقام کا توریت میں حرب درج ہے۔ انگریزی تلفظ میں Horeb سب نے آ کر گھیر لیا اپنے رہبر و پیمبر کو۔ ملا کی دوڑ مسجد۔ بندہ کا سہارا دعا۔ موسیٰ نے دعا کی اس حاجت روا سے، جس پر پہاڑ کا جوف اور ہر پتھر کا بطن آئینہ ہے حکم ملا کہ اس وادی کو ہماری رحمت کے چشموں سے محروم نہ سمجھو، سامنے کی چٹان

پر جاؤ۔ اس پر اپنے عصا کی ضرب لگاؤ پھر دیکھو کیسا پانی اُبلتا ہے۔ آپ گئے تعمیل ارشاد کی۔ پانی نکلا۔ اور نکلا بھی تو اس تجلی حکمت کے ماتحت کہ ایک نہیں پورے بارہ دھارے پھوٹ بہے! ——— ٹھیک بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی مناسبت سے!

توریت میں ذکر تعداد کا نہیں، اس لئے قرآن کے معترضین و معاندین بول اٹھے کہ قرآن نے یہ ذکر بارہ کی تعداد کا کہاں سے کر دیا! خدا کی شان کہ اگلوں کے اس انکار کا جواب پچھلوں نے اپنی تصدیق سے دیدیا۔ جارج سیل قرآن مجید کا پرانا انگریزی مترجم ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر اپنے حاشیہ میں لکھتا ہے۔

"ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے، صراحت سے بیان کرتا ہے کہ چٹان سے پانی بارہ مقامات سے نکلا تھا۔"

اور ایک دوسرے مسیحی سیّاح کا مشاہدہ نقل کرتا ہے۔

"چٹان میں اس وقت بھی چوبیس سوراخ موجود ہیں، ۱۲ ایک پہلو پر ہیں اور بارہ ان کے مقابل جانب۔"

یہ شہادتیں سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی تھیں، انیسویں صدی میں دنیائے مسیحیت کے ایک اور ممتاز رکن پادری ڈین اسٹینلی Dean Stanley ہوئے ہیں۔ صدی کے وسط میں ارض تورات کے مقامات مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لئے بہ نفس نفیس سفر کیا، اور اپنے مشاہدات و تحقیقات کو ایک مستقل تصنیف Sinai Palestine کے نام سے شائع کیا قرآن کی نہیں بائبل کی تائید و نصرت میں۔ اس میں اس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

"یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے۔ راس سفسفہ کے قریب لیجا Leja کی وسیع وادی میں واقع ہے۔ شگاف اور رخنے جابجا پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ مٹے ہوئے ہیں۔ کچھ بڑے ہیں، کچھ چھوٹے، گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں، اور اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس سب سے پہلے قرآن نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ اشارہ انھیں شگافوں کی طرف ہے۔" (ص ۳۶و۳۷)

صدی دو صدی نہیں، ۳۳، ۳۴ صدیاں گزر جانے کے بعد اگر شگافوں کے دو رویہ نشان بجائے ۲۴ کے ۲۰ یا ایک رویہ نشان بجائے ۱۲ کے ۱۰ رہ گئے ہوں، یا دیکھنے والے کو اتنے ہی نظر آئے ہوں۔ تو یہ بیان قرآنی کی تردید و تغلیط ہوئی یا عین تائید و توثیق؟

سبت شکن یہود کو سزا:

اسرائیلیوں کے ساتھ دشت پیمائی سے طبیعت ملول ہو گئی ہو گی۔ اب اس قوم کے عہد ترقی و تمدن کی طرف آجائیے۔ قرآن مجید اس قوم کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا
لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ۝

"تم اپنے لوگوں میں سے ان سے تو خوب واقف ہی ہو۔ جنھوں نے سبت کے بارے میں احکام سے تجاوز کیا تھا۔ سو ہم نے انھیں حکم دیا کہ بن جاؤ ذلیل بندر۔"

سبت کہتے ہیں ہفتہ کے ساتویں دن، شنبہ یا سنیچر کو شریعت یہود میں یہ دن ایک بڑا مقدس دن تھا۔ اور تقدس کے معنی یہ تھے کہ اس روز سارا دنیوی کاروبار بند رہے (اور اسی میں شکار کھیلنا بھی آگیا) اور یہ دن تمام تر عبادت الٰہی کے لئے وقف رہے۔ یہود اس قانون کو بار بار توڑتے تھے۔ مچھلی کا شکار ایک حیلہ کے ساتھ اس روز بھی کیا کرتے تھے۔ آخر میں انھیں اپنی اس قانون شکنی کا خمیازہ بہ صورت عذاب بھگتنا پڑا۔ آیت قرآنی میں ذکر اسی عذاب کا ہے لیکن تفصیل اس کی نہ قرآن میں درج ہے نہ تاریخ میں نظر سے گزری۔ روایتوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ واقعہ حضرت داؤدؑ کے زمانے کا ہے، وہ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ ان کا سال وفات ۹۶۲ سنہ ق م ہے ان کے عہد کی مفصل و مکمل تاریخ محفوظ نہیں۔ اس لئے اگر اور بہت سے واقعات کی طرح اس کا تذکرہ بھی گم ہو گیا ہو، تو کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں۔

روایتوں میں ذکر مچھلی کے شکار کا بار بار آیا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کوئی مقام لب سمندر ہو گا اور قیاس کی حاجت بھی نہیں۔ خود قرآن ہی نے دوسری جگہ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ کہہ کر اسے صاف کر دیا ہے۔ حضرت داؤدؑ کا رقبۂ سلطنت، تاریخ کے طلبہ کو معلوم ہے کہ بحر روم (Mediteranian) اور بحر قلزم Redsea دونوں کے شرقی ساحلوں تک پھیلا ہوا تھا۔

اس لئے وہ مقام بھی جہاں یہ واقعہ پیش آیا، یہیں کہیں ہوگا۔ اسلامی روایتوں میں نام ایلہ کا آیا ہے۔ اور توریت میں ذکر ایلات Elath کا آتا ہے۔ یہ ایک بندرگاہ تھا۔ خلیج عرب کا علاقہ ادوم Edom میں، اور یہ واضح رہے کہ خلیج عرب خود نام ہے بحر قلزم کے شمالی شاخسانہ کا۔ اب نقشہ میں ان ناموں کا کوئی شہر نہیں ملتا نہ ہمارے مفسرین کے ایلہ کا، نہ بائبل کے ایلات کا۔ جغرافیہ کی اصطلاحیں بھی آخر ابدیت لئے نہیں ہوتیں۔ ۲۹ صدیوں کے بعد جغرافی نام اگر اپنی قدیم صورتوں میں نہ باقی رہ جائیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اب نقشہ پر جو نظر دوڑائیے تو اس میں بحر قلزم کے شمالی حصہ کا جو مشرقی دوشاخہ ہے اس کے ساحل پر ایک مشہور بندرگاہ عقبہ دکھائی دے گا۔ یہی عقبہ پرانی بولی میں ایلات یا ایلہ تھا۔ درمیان میں رومیوں کے عہد حکومت میں اس کا کچھ اور نام بھی رہ چکا ہے۔

زمان و مکان کے اس تعین کے بعد قدرۃً سوال نفس واقعہ کی کیفیت وقوع سے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ یعنی آیا مسخ جسمانی ہوگیا تھا۔ جیسا کہ قرآن کی ظاہر عبارت سے مترشح ہوتا ہے اور عموماً اہل تفسیر اسی پہلو کو اختیار کیا ہے یا مسخ ذہنی واخلاقی حدود تک رہا تھا؟ جیسا کہ مجاہد تابعی کا قول شروع سے نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ سو اس کے جواب میں قرآن کے متعلم کو زیادہ کرید کی حاجت ہی نہیں۔ قرآن، واقعہ کے نفس و قوع کی خبر پہلی بار اپنی ذمہ داری پر نہیں دے رہا ہے۔ صرف ایک مسلّم و متعارف واقعہ کی یاددہانی مخاطبین کو کر رہا ہے۔ مجرم سے اشارہ اس کے ایک پچھلے اور اقبالی جرم کی جانب کر رہا ہے۔

عنوان بیان ملاحظہ ہو لَقَدْ عَلِمْتُمُ۔ عَلِمْتُمُ خود ہی کافی تھا یعنی تم تو علم رکھتے ہو۔ واقعہ تمھارا جانا بوجھا ہوا ہے کوئی سنی سنائی روایت یا افواہ نہیں۔ پھر اس پر تاکید اور وہ بھی دوہری، ل کے ساتھ بھی اور قد کے ساتھ بھی! یعنی وہ واقعہ جس سے تم خوب اچھی طرح واقف ہو اس سے انکار کیا معنی، اس میں شک و شبہہ کی بھی گنجائش نہیں ــــــ بس اب اس سے زیادہ تفصیل سے کسی کو بحث کیا؟ وہ جس صورت اور جس کیفیت کے ساتھ بھی پیش آیا ہو، بہر حال تھا تاریخ اسرائیل کا کوئی معلوم و معروف واقعہ۔ اور اسی سے تو قرآن کے معاصرین کو اس پر زبان کھولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

"کفر" سلیمانی کی حقیقت :

داؤدؑ نبی کے بعد اب ان کے فرزند جانشین سلیمانؑ نبی کی طرف آیئے سال وفات ۹۳۳ سنہ ق م۔ قرآن اُن کے بارے میں کہتا ہے، جیسے کسی اہم واقعہ کی خبر دے رہا ہو، کہ

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا

کفر سلیمان نے تو نہیں کیا، البتہ شیطان کفر کیا کرتے تھے

لیکن یہ بات کیا ہوئی؟ قرآن تو خود ہی ان کے نبی اور برگزیدہ ہونے کی شہادت بار بار، صاف صاف دے رہا ہے اور اب یہ کہہ رہا ہے کہ وہ کافر نہ تھے۔ نبی کو جو کافر سمجھے وہ خود ہی کافر۔ اور بالکل ظاہر ہے کہ جو منصب نبوّت سے سرفراز ہوگا، اسے کفر سے نسبت کیا؟ یہ تو کچھ ایسی ہی بات ہوئی کہ شاہ

انگلستان کسی کو ہندوستان کا وائیسرائے بنا کر بھیجیں اور پھر یہ بھی اعلان کرنے لگیں کہ وہ باغیوں اور غدّاروں میں نہیں! —— تو کیا قرآن نے حشو بھی اپنے اندر جائز رکھا ہے؟

اس منزل پر پہنچ کر اس حقیقت کو یاد کر لیجئے کہ قرآن سے قبل دو اور قومیں نبوت کا کلمہ پڑھتی ہوئی اس دنیا میں آباد ہوئی تھیں اور اس وقت تک آباد تھیں۔ ایک یہودی دوسرے نصرانی۔ اِن دونوں نے ایک طرف تو سلیمان بن داؤد کا شمار انبیا ر میں کیا۔ ان کے نام کے صحیفہ کو اپنے صحائف آسمانی کے مجموعہ میں جگہ دی اور دوسری طرف ان کی بدکرداری اور فسق کا ڈھول اس زور سے پیٹا کہ انھیں دائرۂ ایمان و حلقۂ توحید ہی سے خارج کر دیا اور آج تک خارج کئے ہوئے ہیں۔

یہود کی ایک تازہ مستند کتاب ویلنٹائن کی یک جلدی جیوش انسائیکلو پیڈیا Valentine-s-one-volume-jewish Encyclopedia میں ہے۔

"سلیمان نے حکرانی ایک مشرقی فرماں روا کی شان و شوکت سے کی اور انھیں کمزوریوں کے ساتھ بھی۔ یعنی عورتوں سے عشق، عالیشان عمارتیں اور پر تعیش طرز معاشرت یہی چیزیں آخر تباہی لائیں۔ پھر پر تعیش زندگی کے لئے ٹیکس بھی بھاری بھاری لگانے پڑے"۔ (ص ۶۱۱)

دوسری بارہ جلدوں والی ضخیم جیوش انسائیکلو پیڈیا میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے اور اسرائیلیوں کے بڑے قدیم مؤرخ جوزیفس نے تو فسق و فجور

ہی کو نہیں، صاف صاف ارتداد، شرک و بت پرستی کو آپ کی جانب منسوب کر دیا ہے۔

رہے مسیحی، تو ان کے کلیسا میں مدتوں زور و شور سے بحث اس مسئلہ پر جاری رہی کہ سلیمان کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟ اور سینٹ آگسٹائین اور بہت سے آبائے کلیسا نے سوال کا جواب نفی ہی میں دیا! (ملاحظہ ہو ہیسٹنگز کی "ڈکشنری آف دی بائبل"۔ جلد ۴۔ ص ۵۶۷ حاشیہ۔) اور رومن کیتھولک گروہ کی مستند کتاب کیتھولک ڈکشنری میں آج تک یہ لکھا چلا آرہا ہے کہ (مسلمان ناظرین اس "نقل کفر" کو معاف فرمائیں)

"اس کی عیاشی اور غیر کفو بیویوں کی رضاجوئی نے بت پرستی تک اس کی نوبت پہنچادی۔ گو بعض کا خیال ہے کہ اسے آخر وقت توبہ نصیب ہو گئی تھی"۔ (ص ۹۱۲)

اور یہ فتوے اِن مشائخ یہود و آبائے کلیسا کے کچھ طبع زاد نہ تھے جن نوشتوں کو یہ صحائف آسمانی قرار دئے ہوئے ہیں۔ ان تک میں یہ تصریحات موجود ہیں۔

"جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جورُوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔ اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا"۔ "سو از بسکہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے، پر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا"۔ (۱۔ سلاطین ۱۱: ۹ و ۱۰)

"خدا نے اسے تمام اسرائیل کا بادشاہ کیا تو بھی اجنبی عورتوں نے اسے بھی گنہگار کیا"۔ (نحمیاہ، ۱۳ و ۲۶)

نمونہ کے لئے یہ چند تصریحات کافی ہیں۔ کل کہاں تک سنئے گا۔ ان کے بعد بھی کیا یہ خیال باقی رہ سکتا ہے، کہ قرآن نے بلاضرورت خواہ مخواہ ایک بات کہہ ڈالی۔

ضرورت اس صفائی اور تبریہ کی شدید تھی۔ فرد جرم کس ڈھٹائی اور زور کے ساتھ لگ چکی تھی۔ اور یہ الزامات لگانے والے غیر اور بیگانے نہیں، سلیمان کے اپنے اور یگانے ہی تھے! صفائی بھی اسی قطعیت و زور کے ساتھ پیش ہونی لازمی تھی۔ قرآن کا مقصود اسی اتہام کی تردید تھی ــــ اور یہ محض ظن و قیاس نہیں۔ تفسیر ابن جریر میں، ایک نہیں دو دو روایتیں اس مضمون کی منقول ہیں، کہ جب قرآن میں ذکر حضرت سلیمان کا بہ سلسلۂ انبیاء آیا، تو اس وقت کے شائخ یہود نے بہ طور طنز کہا کہ دیکھو تو سہی محمد نے ایک ساحر کو پیمبر بنا دیا! ــ

اب آیت کے الفاظ دوبارہ پڑھئے مَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا صدیوں سے جو الزام تم سلیمان پر لگا ہوا سنتے آرہے ہو، یہ سب غلط و خرافات ہے۔ شرک اور بت پرستی الگ رہی، ان سے تو کوئی کفریہ حرکت بھی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ کفریہ اعمال تو شیاطین کے تھے خود ایسی حرکتیں کرتے تھے، اور رکھ دیتے تھے سلیمان پر!۔

پُرزور صفائی:

شیاطین، (بہ صیغۂ جمع) سے مراد محاورۂ قرآنی میں شیاطین انس بھی

ہوتی ہے یعنی شیطان صفت انسان۔ حضرت کے زمانے میں ان فتنہ پرداز مفسدوں کی کثرت ہو گئی تھی۔ یہ سحر و کہانت کے ماہرین برابر آپ کے خلاف تہمتیں تراشتے رہتے اور غدر و بغاوت پھیلایا کرتے۔ توریت کے صحیفۂ سلاطین حصہ اول کے دو باب ۱۱، ۱۲ انھیں کے قصوں سے لبریز ہیں۔ ہمارے مفسرین و متکلمین میں سے بعض کا خیال انھیں کی طرف گیا ہے۔

غرض قرآن نے سلیمان کی صفائی کا اعلان کیا، بڑے پُرقوت دعووں کے مقابلے میں کیا اور دنیا نے مخالفین و معاندین کی دنیا نے، قرآن ہی کی آواز کو سنا۔ یہاں تک کہ اس بیسویں صدی میں اہل کتاب کے جو محققین اور "اسکالرز" ہیں، ان کے قلم سے تصدیق و تائید، بائبل کی نہیں قرآن ہی کے بیان کی نکل رہی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے آخری یعنی چودھویں ایڈیشن میں جو مقالہ Solomon پر ہے اس میں صاف الفاظ میں تائید ان کے موحد ہونے کی ہے۔ Solomon was a sincere worshipper of Jahweh۔ سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے"۔ (جلد ۲۰ ص ۹۵۲)

اور اس سے چند سال قبل خاص بائبل ہی کی انسائیکلوپیڈیا، چار جلدوں میں، بائبل کے محققین اور ماہرین کے قلم سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں تو یہاں تک صراحت ملتی ہے، کہ بائبل کی جن عبارتوں میں سلیمان کے کفر و شرک کا ذکر موجود ہے، وہ خود الحاق یا جعلی ہیں! اور اس کے بعد یہ کہ:۔

"یہ تو غالباً صحیح ہو کہ سلیمان کے حرم متعدد تھے۔ اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی۔ لیکن انھوں نے نہ تو عبادت گاہیں ہی سب کے لئے

تیار کرائیں، اور نہ خود خدائے واحد کی پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش جمع ہونے دی۔" انسائیکلوپیڈیا بلیکا۔ کالم ۴۶۸۹)

اسی طرح ہیسٹنگز کی پانچ ضخیم مجلدات والی ڈکشنری آف دی بائبل میں ہے:

"یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ بادشاہ نے خدائے واحد پر سے اپنا ایمان ترک کر کے شرک اختیار کر لیا ہو، البتہ اس شہرت کے اسباب آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔" (جلد ۴ صفحہ ۵۶۷)

ایک اُمّی کے لائے ہوئے علوم پر علمی دنیا کی ایسی برجستہ گواہیاں بجائے خود ایک معجزہ ہیں۔

سحرِ بابل:

"کفر" سلیمانؑ ہی کے سلسلہ کی ایک چیز یہود کا مشغلہ سحر و کہانت ہے قرآن اپنے معاصر یعنی چھٹی صدی مسیحی کے یہود عرب کے ذکر میں کہتا ہے۔ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۵ اور پھر چند لفظوں کے بعد وَمَا أُنزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ ط تشریح دونوں فقروں اور پوری آیت کی یہ ہوئی، کہ یہود رسول کی تعلیمات پر تو کان دھرتے نہیں، قرآن کی آواز تو سنتے نہیں۔ یہ پیچھے لگے ہوئے ہیں اس سحر کے جو شیاطین عہد سلیمان میں کرتے تھے (اہل لغت نے تصریح کر دی ہے علیٰ ملک سلیمان بہ معنی فی ملک سلیمان کے ہے) اور اس سحر کے بھی پیچھے لگے ہیں جو بابل میں دو فرشتوں پر کسی مصلحت تکوینی سے اتارا گیا تھا۔

قرآن کو مقصود یہاں یہود کی محبت و مناسبت سحر کے ساتھ بیان کرنا

تھی، لیکن ضمناً یہ بھی کہہ گیا، کہ سحر دو رائج تھے۔ ایک سحر حضرت سلیمانؑ کے ملک والا یعنی سحر فلسطینی، اور دوسرا سحر بابل، اور یہود ان دونوں میں سے بند کسی میں نہ تھے۔ اب گویا تین باتیں الگ الگ ہوئیں:

ایک یہود کا سحر پیشہ ہونا، سحر پر حریص ہونا۔

دوسرے، سحر کا مرکز فلسطین ہونا۔

تیسرے، سحر کا ایک مرکز بابل ہونا۔

امر اول کی شہادت خود یہود ہی کے صحائف مقدس میں موجود ہے بائبل کی کتاب سلاطین ۲ میں ہے:

"اور انھوں نے اپنے بیٹے بیٹی کو آگ کے درمیان گزارا۔ اور فال گیری اور جادوگری کی۔ ان باعثوں سے خداوند بنی اسرائیل پر بہت غصہ ہوا اور اپنی نظر سے گرا کر دور کر دیا۔" (۱۷:۱۷، ۱۸)

اور صحیفۂ میکاہ Micah میں اسرائیلیوں کے مبارک ایام اقبال کی پیشین گوئیوں کے سلسلہ میں ہے:

"تیرا ہاتھ تیرے دشمنوں پر بلند کیا جائے گا اور تیرے سارے مخالف نیست ہو جائیں گے اور اسی دن میں یوں ہوگا خداوند فرماتا ہے، کہ میں تیرے ہاتھ کی جادوگریاں منقطع کروں گا اور تیرے یہاں ساحر پھر نہ ہوں گے۔" (۵: ۱۰ و ۱۲)

یہ صرف دو حوالے پیش کئے گئے، ورنہ یہود کی ساحری، جادوگری، فال گیری وغیرہ کے تذکروں سے تو ان کے صحائف مقدسہ کے ورق کے ورق

رنگین ہیں۔ ان کے ہاں کے جدید مستند ترین مخزنِ معلومات جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے۔

"جادوگری سارے قدیم بنی اسرائیل میں پھیلی ہوئی تھی۔ سحر کا علم عدالت العالیہ کا رکن بننے کے لئے لازمی تھا۔ بڑے سے بڑے علماء سفلیات کے ماہر ہوتے تھے۔ اور عوام تو جادوگری پر فدا تھے۔" (جلد ۸۔ صفحہ ۲۵۵)

یہ ذکر آغاز اسلام سے بہت قبل کا ہے۔ بعد آغاز اسلام یعنی نزول قرآن کا ماجرا محب اسلام نہیں، دشمن اسلام اور یہودی النسل، آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیس کی زبان سے سنئے:۔

"وہ لوگ [یعنی یہود عرب] سحر کے ماہر تھے، اور بہ مقابلہ کھلم کھلا قتال کے سفلی عملیات کو زیادہ پسند کرتے تھے۔" (سیرۃ نبوی بر کتاب محمدؐ۔ صفحہ ۱۸۹)

فلسطینی سحر تو انھیں آبائی ورثہ میں ملا تھا، رہا سحر بابل، سو وہ ان شوقینوں نے اپنے شوق سے سیکھ لیا تھا۔ بابل سے مراد وہ ملک ہے جو آج عراق کہلاتا ہے اور کسی زمانے میں کلدانیہ کہلاتا تھا۔ انگریزی میں اسی کو کالڈیا کہتے ہیں اس کے جو مذہبی کتبے آج برآمد ہوئے ہیں وہ تمام تر سحریات، سفلیات، عملیات سے لبریز ہیں۔ اس کا سحر ضرب المثل ہے۔ یہاں تک کہ انگریزی زبان میں کلدانی Chaldean مرادف ہو گیا ہے ساحر کے۔ اور محاورہ میں اس فقرہ He is a Chaldean کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ ساحر ہے۔ بابل جب

تباہ ہوا تو اس کے باشندے ادھر ادھر منتشر و متفرق ہو گئے۔ جہاں جہاں گئے، قدرۃً اپنے علوم سحر و کہانت کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ یہود پہلے ہی سے اس رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ بڑھ کر اہل بابل کا استقبال کیا اور بہترین شاگردانِ استادوں کے ثابت ہوئے جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے۔

"یہود نے ہر حصہ ارض میں بابل کا ادب واحترام جاری رکھا۔" (جلد ۲ صفحہ ۴۱۳)

ہاروت وماروت:

ہاروت وماروت کے فرشتہ ہونے سے، اور ان پر سحر نازل ہونے سے طبیعت کو وحشت بالکل نہ ہو۔ جب کسی قوم میں سحر و کہانت کا شمار علوم عالیہ میں ہونے لگے، سحر و کہانت اور نبوت و رسالت کے درمیان التباس ہونے لگے اور لوگ نبی کی نبوت سے انکار کر کے اسے بے تکلف ساحر قرار دینے لگیں، تو اس صورتحال میں یہ بات دل کو بالکل لگتی ہوئی ہے کہ قوم کو اس باب راہ ہدایت دکھانے اور سحر و نبوت کے درمیان فرق سمجھانے کے لئے جنسِ انبیاء سے علاوہ کوئی اور مخلوق بھیجی جائے۔ دو فرشتے انسانی لباس میں اس غرض سے اس مرکز سحر اور مستقر کہانت میں بھیجے گئے۔ لوگ ان کے پاس آتے۔ یہ انھیں رائج الوقت کفریات سے روکتے، منع کرتے، سمجھاتے بجھاتے، اب ان میں جو بدفطرت ہوتے وہ اس قسم کے سوالات کرید کرید کر کرتے، کہ سحر کہتے کسے ہیں۔ عملیات سحری ہوتے کیا کیا ہیں۔ کن کن اغراض کے لئے ہوتے ہیں۔ ذرا انھیں تفصیل سے بیان کیجئے، جب تو ہم سمجھیں —— فقہ کی کتابوں سے معاصی و جرائم کے، اور طب کے رسالوں سے بدچلنی کے

سبق ڈھونڈھ نکالنے والے کیا آج بھی کثرت سے موجود نہیں ہے؟ ـــــ تو غرض یہ کہ اِن حیلوں تدبیروں اور چالاکیوں سے یہ فرشتوں کی زبان سے بھی جرائم و معاصی کی تعلیم حاصل کر لیتے! اور فرشتے بیچارے اپنی زبان سے یہ کہتے ہی رہ جاتے۔ کہ ہم تو ذریعہ آزمائش بنا کر بھیجے گئے ہیں (نَحْنُ فِتْنَةٌ) کہیں ہم سے الٹی تعلیم بدی و بدکرداری کی نہ حاصل کرنے لگنا (فَلَا تَكْفُرْ)

خیال نہ گزرے کہ سحر جیسی گندی چیز کے لئے لفظ نزول و انزال کیسا۔ (وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ) اس سے تو فی الجملہ عظمت ہی نکل رہی ہے سحر کی! ـــــ وہم بے بنیاد ہے۔ نزول تکوینی کے سلسلہ میں تو یہ لفظ بیماری ہوت قحط، خشک سالی، یہاں تک کہ عذاب و بلا سب کے لئے عام ہے۔ اور محاورہٗ قرآنی میں اس کا استعمال روزی (رزق) اور پوشاک (لباس) کے لئے بھی ہوا ہے۔ اور پانی (ماء) لوہے (حدید) اور چوپائے (انعام) کے لئے بھی۔ اور جرائم سے گہری واقفیت تو بعض اوقات خود مجرم سے بڑھ کر پولیس اور مجسٹریٹ کو ہوتی ہے اور مرض کے شدائد سے واقفیت مریض سے بڑھ کر طبیب کو۔

بنی اسرائیل اور قتلِ انبیاء:

قرآن کی عدالت میں بنی اسرائیل مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور ایک طویل فردِ جرم انھیں سنائی جا رہی ہے۔ اس میں بار بار یہ ذکر آتا ہے کہ اس قوم نے اپنے انبیاء کے ساتھ جبر اور بدسلوکیاں جو کیں وہ تو کیں ہی، باقی بعض اوقات انھیں قتل تک کر ڈالا ہے! الزام ہے یقیناً سنگین اور

قومی ضمیر کو تھرا دینے والا۔ لیکن ساتھ ہی اتنا جنچا تلا، کہ تاریخ کی زبان کو انکار پر کھلنے کی گنجائش ہی نہیں قتل اشعیاہ Isaiah نبی کا، قتل یرمیاہ Jeremiah نبی کا قتل زکریا Zacharias نبی کا، قتل یحییٰ John نبی کا سب سے آخر میں اقدام قتل عیسیٰ مسیح کا۔ یہ چند عنوانات جلی ہیں۔ اسرائیل کی تاریخ سفاکی و بہیمیت کے۔

شہادت خود انھیں کے صحائف مقدس کی سنئے:۔

"وہ نافرمان نکلے اور تجھ سے پھر گئے۔ اور انھوں نے تیری شریعت کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکا۔ اور تیرے نبیوں کو جو ان کو نصیحت دیتے تھے کہ انھیں تیری طرف پھرا لائیں، قتل کیا۔ اور انھوں نے اپنے کاموں سے تجھے غصہ دلایا۔" (نحمیاہ ۹: ۲۶)

"تمھاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کے مانند تمھارے نبیوں کو کھا گئی ہے۔" (یرمیاہ۔ ۲: ۳۰)

"اور خداوند ان کے باپ دادوں کے خدا نے اپنے رسولوں کی معرفت سے ان کے پاس پیغام بھیجا لیکن انھوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھے میں اڑایا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اس کے نبیوں سے بدسلوکی کی، یہاں تک کہ خداوند عالم کا غضب اپنے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔" (۲۔ تواریخ۔ ۳۶: ۱۵ و ۱۶)

انجیلوں میں حضرت مسیح کی زبان سے صراحتیں اس سے بڑھ کر موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو انجیل متی۔ ۲۳: ۳۱ و ۳۷۔ نیز انجیل لوقا۔ ۱۳: ۳۴)

شہادتِ یحییٰؑ :

حضرت یحییٰؑ اس قوم کے آخری نبی (بجز حضرت عیسیٰؑ کے) تھے۔ عہدِ قبل تاریخ کی تاریکیوں میں نہیں، تاریخ کی روشنی کے زمانے میں تھے۔ بادشاہ وقت ہیرودؔ نے شریعتِ وقت کے خلاف اپنی حسین بیوہ بھاوج کو اپنی ملکہ بنا لیا تھا۔ حضرت یحییٰؑ نے آکر اس اقدام پر نصیحت اور ملامت کی، ملامت بادشاہ سے زیادہ ملکہ کو ناگوار گزری۔ ناصح جیل بھجوائے گئے۔ بادشاہ کی سالگرہ کا دن آیا، بادشاہ دل میں انھیں بے قصور سمجھ ہی رہا تھا۔ ارادہ کیا کہ آج جشن کی خوشی میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ انھیں بھی رہا کر دوں گا۔ بزم نشاط میں بیٹھا، تو اتفاق سے شراب معمول سے زیادہ پی لی۔ نشہ تیز ہوگیا۔ سامنے اسی ملکہ کی لڑکی پہلے شوہر سے۔ ناز و ادا، حسن و جمال کی پتلی، رقص کو کھڑی ہوئی، مخمور بادشاہ بے خود ہوکر بولا "مانگ کیا انعام مانگتی ہے۔ آدھی سلطنت دیدینے کو تیار ہوں"۔ لڑکی سکھائی پڑھائی ہوئی تھی۔ ماں کے اشارہ سے بولی "مجھے تو یحییٰ کا سر چاندی کے طشت میں چاہیے"۔ بادشاہ کا نشہ ہرن ہوا۔ بولا "اے آج جشن مسرت کے دن اپنا ہاتھ خون سے رنگوں"؟ سفاک رقاصہ نے ٹھنک کر کہا "لوں گی تو وہی سر لوں گی"۔ بادشاہ نے حکم دیدیا اور دم کے دم میں خدا کے اس نبی اور قوم اسرائیل کے تقریباً آخری پیمبر کا سر مبارک جیل سے کٹا ہوا، اور چاندی کے طشت میں لگا ہوا، آگیا۔ ملاحظہ ہو انجیل مرقس، باب ۶ کی آیات ۱۶ تا ۲۸۔ اور انجیل متی کے باب ۱۴ کی آیات ۳ تا ۱۱۔ نیز مشہور قدیم یہودی مؤرخ جوزیفس کی تاریخ "آثار قدیمۂ یہود" Antiquities of The Jews کے باب ۱۸ کی

فصل پنجم۔ اور جیوش انسائیکلوپیڈیا۔ جلد ۷، ص ۲۸۹

خونِ ناحق :

ابھی گزر چکا ہے کہ قرآن نے اسرائیلیوں کے ہاتھوں انبیاء کے قتل ناحق کا ذکر کیا ہے۔ قتل تو خیر لیکن اس کے ساتھ "ناحق" (بِغَیْرِ الْحَقِّ) کی قید کیسی۔ قتل انبیاء تو ظاہر ہے کہ جب کبھی بھی ہوگا، ناحق ہی ہوگا۔ حق ہو ہی کب سکتا ہے پھر کیا یہ لفظ حشو ہے؟ ــــ قرآن جیسے بلیغ اور حکیمانہ کلام میں حشو کیسا۔

جواب یہ ہے کہ حشو نہیں۔ مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ قتل انبیاء بجائے خود اور عنداللہ تو ہمیشہ ہی ناحق ہوگا، لیکن بدبخت قاتلوں نے جب جب اپنے ہاتھ ان معصوموں کے خون سے رنگین کیے، وہ قتل ایسے تھے کہ خود انھیں کے معیار سے، ان کے معیار معدلت و ضابطہ و قانون سے بھی ناحق تھے۔ ہمارے بعض نکتہ سنج مفسرین اس نکتہ تک از خود پہنچ گئے۔ اور بغیر قدیم قوموں کی تاریخوں کا مطالعہ کیے ہوئے خود ہی لکھ گئے بِغَیْرِ الْحَقِّ أی کان ذٰلِکَ عِنْدَهُمْ أَیْضًا بِغَیْرِ الْحَقِّ یعنی انصاف خداوندی کے خلاف تو تھا ہی، عدالتوں کا جو ضابطہ اور فوجداری کا جو قانون ان کے ملک و قوم میں جاری تھا اس کے بھی خلاف تھا۔

مسیحؑ عدالت میں :

قرآن نے یہ بات ضمناً اور محض ایک دوسرے بیان کی لپیٹ میں ساڑھے تیرہ سو برس قبل کہہ ڈالی تھی۔ اب کچھ عرصہ ہوا، یورپ کے ماہرین قانون نے

قدیم نوشتوں کی مدد سے حضرت مسیحؑ کے مقدمہ کی روئداد از سر نو مرتب کی ہے اور ایک کتاب انگلستان کے بیرسٹر اینس Innes نامی نے Trial of Jesus Christ کے نام سے، اور دوسری، اٹلی کے ایک ایڈوکیٹ روزیڈی Rosadi نے Trial of Jesus کے عنوان سے شائع کی، دونوں کتابوں کے مطالعہ سے صاف نظر آجاتا ہے کہ حضرت کے مقدمہ میں یہ نہیں ہوا کہ رومی حاکم عدالت سے کوئی اجتہادی غلطی سرزد ہو گئی بلکہ ہوا یہ کہ یہود نے ایک جھوٹا استغاثہ گڑھا۔ اور پہلے اپنی مذہبی عدالت میں بے ضابطہ کارروائیاں کرکرا کے اور پھر ملک کی فوجداری عدالت میں رومی حاکم پر طرح طرح کے زور و دباؤ ڈال ڈال کر سولی کا حکم دلانے میں کامیاب ہو گئے! —— یہ اندھیر جب رومیوں کے روشن اور تاریخی عہد حکومت میں، رومی جیسی آئین دوست و قانون سرشت حکومت کی عدالت میں ممکن ہو گیا تو قدیم تر انبیاء کی مظلومیت اور اس عہد قبل تاریخ کی تاریکیوں اور ضابطہ شکنیوں کا کیا ٹھکانا! اب جاکر کچھ قدر ہوئی۔ قرآن کے اس چھوٹے سے دو لفظی فقرہ بِغَیْرِ الْحَقِّ کی۔

انجام مسیحؑ:

حضرت مسیحؑ کے مقدمہ تک تو آپ پہنچ ہی گئے، اب ایک نظر دنیا میں اُن کے انجام پر بھی کرتے چلئے۔ یہود کا دعویٰ ہے کہ ہمارے درمیان یسوع ناصری نامے (نعوذ باللہ) ایک شعبدہ باز اور مفسدہ پرداز، انبیائے سابق اور شریعت موسوی کی توہین کرنے والا پیدا ہوا تھا، سو ہم نے اس کا کام تمام کر دیا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ خدا دنیا کے گنہگاروں پر رحم کرنا چاہتا تھا لیکن سب کو

یک لخت معاف کر دینا اس کے قانون عدل کے منافی تھا، اس لئے وہ خود یا اُس کا اکلوتا بیٹا، انسان کے قالب میں اور یسوع نام رکھ کر ظاہر ہوا۔ اس نے اپنے کو نوع انسانی کے کفارہ کے طور پر پیش کر دیا۔ اس نے انسانی قاعدہ کے مطابق سولی پر چڑھ کر جان دی۔ اور وہ تیسرے روز زندہ ہو کر آسمان پر چلا گیا۔ —— گویا حضرتؑ کی نفس موت پر غالی دشمن اور غالی دوست دونوں متفق ہیں۔ اور اب ایک عرصہ سے قادیان کا جدید فرقہ بھی انھیں کا ہمنوا ہو گیا ہے۔

قرآن نے بے جگری کے ساتھ یہود و نصاریٰ دونوں کے مسلمات کو چیلنج دیدیا اور علانیہ کہہ دیا وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ٥ (کہ یہود آپ کو نہ تو ہلاک کر سکے اور نہ سولی ہی پر چڑھا سکے بلکہ خود ہی دھوکے میں پڑ گئے، انھیں پر حقیقت مشتبہ ہو گئی) دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ دشمنوں نے آپ کی جان لینا چاہی بلکہ اپنے خیال میں لے ڈالی بھی، لیکن حقیقۃً ایسا نہیں ہوا، دشمن خود وہم والتباس کا شکار ہو گیا —— لیکن ایسی صورت ممکن کیونکر ہوئی؟ تاریخی قرائن، قیاسات شواہد اپنا فیصلہ کیا سناتے ہیں؟

حضرت مسیح کا زمانہ قبل تاریخ کا زمانہ ہے۔ آپ کا ملک، آپ ہی کے ہم قوم یہود یا اسرائیلیوں کا ملک تھا۔ جیسے ہندوستان ہندوستانیوں کا ہے یہ صوبہ یہودیہ Judea ارض شام کا علاقہ تھا۔ اس پر حکومت اعلیٰ یہود کی نہیں، بلکہ اپنے زمانہ کی مشہور و مہذب رومی قوم کی تھی۔ جیسے ہندوستان

پر آج حکومت برطانوی قوم کی ہے۔ اور یہودیہ اسی طرح ایک حصہ رومن ایمپائر کا تھا، جیسے آج ہندوستان ایک حصہ برٹش ایمپائر کا ہے۔ لیکن اس اقتدار اعلیٰ کے ماتحت نیم سیاسی آزادی اور مذہبی حیثیت سے تقریباً پوری آزادی یہودیہ کو حاصل تھی۔ تقریباً ایسی ہی جیسے آج برطانیہ کے زیر سیادت مصر کو حاصل ہے یہودیہ کا نیم خود مختار فرمانروا اس وقت مشہور زبردست جابر ہیرودؔ تھا۔ حضرت یحییٰ کا سر چند سال قبل اسی کے حکم سے قلم ہو چکا تھا۔ ملک کی فوجداری اور دیوانی عدالتیں نیز فوج اور پولیس کے محکمے رومی حکومت کے ماتحت تھے۔ یہودی رعایا کے مقدمے پہلے خود آبائے یہود و مشائخ بنی اسرائیل کی مذہبی عدالتوں میں پیش ہوتے تھے، فیصلے وہیں سے صادر ہوتے تھے لیکن جرم اگر فوجداری کا ہوتا تو سزا کے نفاذ کے لئے مقدمہ دوبارہ ملکی عدالت میں پیش ہوتا، اور فیصلہ نافذ وہیں کا ہوتا، سنہ غالباً ۲۹ سنہ مسیحی تھا۔ جب مشائخ یہود کے حکم سے یسوع ناصری نامی "مجرم" کی گرفتاری عمل میں آئی۔ روایات سب اس پر متفق ہیں کہ آپکو پہلے یہود کی مذہبی عدالت سے سزا "ارتداد" کے جرم میں، موت کی ملی۔ اور پھر ملکی عدالت میں رومی حاکم نے بھی بغاوت کی دفعہ میں حکم سولی کا دیا۔ لیکن اس کے آگے یہ امر محقق و مسلم نہیں، کہ سولی پر چڑھائے بھی آپ ہی گئے بلکہ قولی شبہات سب اس کے برعکس ہیں۔

زمان و مکان کی تعیین ہو چکی۔ اب صورتحال کو پوری طرح پر سمجھنے

لہ سنہ تحریر ۱۹۴۲ء

کے لئے ماحول کے خصوصیات ذیل کو نگاہ میں رکھئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ملک میں آبادی یہود کی تھی اور پولیس عدالت، فوج رومیوں کی۔ رومی مشرک بت پرست تھے، یہود توحید و نبوت کے قائل رومیوں کی زبان لاطینی تھی۔ یہود کی بول چال کی زبان سریانی تھی، اور کتابی زبان عبرانی۔ رومی یوروپی نسل کے تھے، اور یہود سیماطیقی یا سامی نسل کے، غرض یہ کہ مذہب، زبان، لباس، وضع، تمدن، معاشرت، صورت ہر چیز میں یہود رومیوں سے الگ اور ممتاز تھے جیسے ہندوستانی انگریزوں سے تھے۔ اور اس کا نتیجہ قدرۃً یہ تھا کہ ایک رومی کے پہچاننے میں یہود کو ایسی ہی دقت پیش آتی تھی، جیسے ہندوستانیوں کو گوروں کے پہچاننے میں اور گوروں کو کالوں کے شناخت کرنے میں، ہندیوں کی نظر میں سب فرنگی یکساں، فرنگیوں کی نظر میں سب ہندی ہم شکل ٹھیک اسی طرح رومیوں کی نظر میں کل یہود یکساں دکھائی دیتے تھے۔

اور یہ معلوم ہے کہ رومی عدالت کے چپراسی، پیادے، پولیس گارڈ اور رومی جیل کے برقنداز (وارڈر) عموماً رومی ہی ہوتے تھے، اُن سے یہ توقع رکھنا بالکل بیجا تھی کہ وہ کسی معمولی مجرم کی خاص طور پر شناخت رکھیں گے حضرت مسیحؑ پیغمبر خدا یا "ابن اللہ" کی اہمیت اب دنیا کی نظر میں جو کچھ بھی ہو اس وقت رومی حاکم اور رومی سپاہیوں کی نگاہ میں یسوع ناصری نامی ایک شخص کی حیثیت بجز بغاوت کے ایک عام و معمولی مجرم کے اور کیا تھی؟ تھوڑی بہت جو کچھ بھی مخالفانہ حیثیت سے تھی، وہ یہود کی نظر میں تھی رومیوں

کی نگاہ میں تو اتنی بھی نہ تھی۔

ان عام حالات کے ساتھ یہ خاص حقیقت بھی پیش نظر رکھئے کہ حضرت کو لوگوں کی نظر بلکہ اپنے ہی ہم قوم دشمنوں اور مخالفوں کی نظر بچا کر نکل جانے میں خاص کمال تھا۔ مسیحی اسے آپ کے معجزات میں شمار کرتے ہیں، یہود اسے (نعوذ باللہ) آپ کی شعبدہ بازی پر محمول کرتے ہیں بہر حال نفس واقعہ سب کو تسلیم ہے (ممکن ہے اس کا ایک ظاہری سبب آپ کی گوشہ گیری اور خلقت سے کم آمیزی بھی ہو) اناجیل میں آپ کی اس خصوصیت کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ ناصرہ میں ایک وعظ کے بعد کا منظر حسب روایت لوقا، ذرا غور سے ملاحظہ ہو۔

"جتنے عبادت خانے کے اندر تھے ان باتوں کے سنتے ہی غصہ میں بھر گئے اور اٹھ کر اس کو شہر سے باہر نکالا اور اس پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے جس پر ان کا شہر آباد تھا، تاکہ اسے سر کے بل گرادیں۔ مگر وہ ان کے بیچ سے نکل کر چلا گیا۔" (لوقا ۴: ۲۸-۳۰)

خاص یروشلم میں بھی ایک بار یہود نے مشتعل ہو کر آپ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ اور ناکام رہے۔

"انھوں نے پھر اس کے پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔" (یوحنا ۱۰: ۳۹)

اسی انجیل میں ایک دوسرے موقع کا بیان سنئے۔

"یسوع نے ان سے کہا، میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں پیشتر اس سے

کہ ابراہیم پیدا ہوا، میں ہوں۔ پس انھوں نے اس کے مارنے کو پتھر اٹھائے مگر یسوع چھپ کر ہیکل سے نکل گیا۔ (یوحنا ۸: ۵۹)

یہ سب منظر تو دشمنوں کے مقابلہ میں پیش آئے۔ کبھی کبھی مریدوں اور معتقدوں کے سامنے بھی آپ کی ہیئت بدل جاتی تھی۔

"یسوع نے پطرس اور یعقوب اور یوحنا کو ہمراہ لیا اور انھیں الگ ایک اونچے پہاڑ پر اکیلے میں لے گیا اور ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی۔" (مرقس ۹، ۹: ۲)

انجیل لوقا میں ہے:۔

"جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرہ کی صورت بدل گئی، اور اس کی پوشاک سفید براق ہو گئی۔ (لوقا۔ ۹: ۲۹)

اور انجیل متی میں ہے:۔

"ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی، اور اس کا چہرہ سورج کے مانند چمکا اور اس کی پوشاک نور کے مانند سفید ہو گئی"۔ (متی ۱۷: ۲)

آخری اور انتہائی بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ جب واقعۃً آپ کی گرفتاری گستمنے کے باغ میں ہوئی ہے، تو اگرچہ گرفتار کرنے والے پوری بھیڑ کی بھیڑ تھے۔ تاہم اس بھیڑ کو بھی اطمینان نہ تھا کہ آپ کو پہچان سکے گی۔ چنانچہ شناخت کے لئے آپ کے بارہ حواریوں میں سے، ایک غدار حواری یہوداہ نامی کو توڑ لیا۔ اس جزو پر ساری انجیلیں متفق ہیں۔ متی میں ہے:۔

یہوداہ جوان بارہ میں سے ایک تھا آیا اور اس کے ساتھ ایک

بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لئے ہوئے سردار کاہنوں اور
قوم کے بزرگوں کی طرف سے آپہنچی اور اس کے پکڑوانے والے
نے انھیں یہ بتا دیا کہ جس کا میں بوسہ لوں، وہی ہے اسے پکڑ لینا۔"
(متی ۳۶: ۴۷ و ۴۸)

مرقس کی روایت بھی تقریباً بالکل انھیں الفاظ میں ہے۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھنے کے بعد ایک کڑی یہ ملائیے کہ رومیوں کا جو سولی گھر تھا، وہ عدالت سے اچھے خاصے فاصلے پر تھا۔ انجیلوں میں اس مقام کا نام لاطینی تلفظ کے مطابق کیلوری calvary اور عبرانی تلفظ کے لحاظ سے golgotha گلگتا آتا ہے اور اردو میں اس کا ترجمہ کھوپری یا کھوپری کی جگہ کیا گیا ہے۔ اس جگہ کا تعین صحت کے ساتھ تو دشوار ہے۔

تاہم اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ مقام تھا شہر سے دور۔ شہر پناہ کے باہر۔ انجیل ہی کے ایک صحیفہ "عبرانیوں کے نام خط" میں ہے (۱۳: ۱۲) کہ یسوع نے بھی اُمت کو اپنے خون سے پاک کرنے کے لئے "دروازہ کے باہر[1]" دکھ اٹھایا غرض عدالت سے وہاں تک فاصلہ حضرت مسیح کو رومی پولیس گارڈ کی نگرانی میں پیدل طے کرنا تھا۔ اور اتنا ہی نہیں سولی کی ایک وزنی لکڑی آپ کو خود اٹھا کر لے چلنی تھی۔ صلیب یا سولی کی شکل تو آپ کے ذہن میں ہوئے ہی گی



ایک ستون تو زمین میں گڑا ہوا ہوتا تھا باقی دوسری لکڑی جو اس کے اوپر آڑی آڑی جمائی جاتی تھی اور اسی پر مجرم کے دونوں ہاتھ پھیلا کر کس دیئے جاتے تھے

[1] بعض نسخوں میں ہے کہ "پھاٹک کے باہر ہو کر"۔

اور اُن میں کیلیں ٹھونک دی جاتی تھیں، وہ وہاں لگی ہوئی نہیں ہوتی تھیں بلکہ عدالت میں رہا کرتی تھیں اور حکم سزائے موت سننے کے بعد اسے مجرم کو اپنی پیٹھ پر لاد کر سولی گھر تک چلنا پڑتا تھا۔

اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ ہونے دیجئے کہ حکومت کو آپ سے[2] مطلق پرخاش نہ تھی، بلکہ حاکم عدالت تو آپ کو بے قصور پاکر چھوڑ دینے ہی پر تلا ہوا تھا، اور آپ کو سزا جو دی وہ محض یہود کے بلوہ کے خوف سے۔ انجیل متی میں ہے۔

"جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا بلکہ الٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب دے کر کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔" (متی ۲۷: ۲۴ و ۲۵)

غرض یہ کہ حکومت اور اس کے کارندوں کی طرف سے آپ کی کسی خاص نگرانی کا کوئی محل نہ تھا، اور نہ حکومت کو اس کی کوئی خاص فکر تھی کہ آپ بچ کر نکلنے نہ پائیں اور ہاں یہ ضروری جزائر بھی یاد رہے کہ جب حکم سنایا گیا ہے، تو جمعہ کا دن تھا اور سہ پہر کا وقت یعنی سبت (یہود کے مقدس دن، سنیچر کی) شب عنقریب شروع ہونے والی تھی۔ اور مزید یہ کہ کل صبح عید یہود تھی[1]۔ شام اگر کہیں راہ ہی میں ہو گئی تو پھر کچھ کارروائی نہ ہو سکے گی۔

[1] اس جشن کا اصطلاحی نام Passover یا عید "فسح" ہے۔

اب صورتحال کو ایک بار پھر نظر کے سامنے لائیے۔ حضرت مسیحؑ لاغر وناتواں، قاعدۂ مقررہ کے مطابق پشت مبارک پر بوجھل صلیب کو اٹھا کر سولی گھر روانہ ہوئے ہیں۔ وقت کم، فاصلہ زیادہ۔ ساتھ میں رومی سپاہی تو وہی گنتی کے چند تھے البتہ خود حضرتؑ ہی کے ہم قوم، ہم وضع ہم لباس یہود، انبوہ در انبوہ ساتھ تھے، آپ کو ستاتے ہوئے، چھیڑتے ہوئے، آپ پر آوازے کستے ہوئے۔ صورتحال کا یہ نقشہ ذہن کے سامنے لا کر اپنے ہی سے سوال کیجئے کہ اب کیا ہوا ہوگا؟ رومی سپاہی اپنی قومی برتری کے نشہ میں مست، خود تو یہ کرنے سے رہے، کہ اپنی رعایا اور پھر مجرم رعایا کا اٹھانے والا بوجھ خود اپنے سر یا پشت پر لاد لیں۔ پھر ہجوم کی کثرت سے تنگ الگ ہو رہے تھے، اور دیر خواہ مخواہ ہو رہی تھی۔ قدرۃً یہی کیا ہوگا کہ اسی ہجوم میں سے کسی شخص کو پکڑ اور عجب نہیں کہ کچھ ڈانٹ ڈپٹ کر کے، صلیب اسی پر لاد دی ہو۔ اور یہ شخص یقیناً ایسا ہوگا جو حضرت کے قریب آکر بار بار چھیڑ چھاڑ کر رہا ہو اور کچھ ہم شکل بھی ہو تو بعید نہیں "کیا ہوگا" نہیں، واقعۃً ایک شخص کو پکڑ، صلیب اس پر لاد دی۔ انجیل متی میں ہے:-

"انھیں شمعون نامی ایک کرینی آدمی ملا۔ اسے بیگار میں پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے۔" (متی۔ ۲۷ = ۲۲)

انگریزی میں اسی شمعون کرینی کو Simon Ihcyrenion کہتے ہیں۔

دوسری روایت مرقس کی سنئے:-

"اور شمعون نام ایک کرینی آدمی سکندر اور روفس کا باپ دہات سے آتے ہوئے اُدھر سے گزرا۔ انھوں نے اسے بیگار میں پکڑا

کہ اس کی صلیب اٹھائے۔" (مرقس۔ ۱۵: ۲۱)

لوقا کا بیان اور زیادہ صریح ہے:-

"اور جب اس کو لئے جاتے تھے تو انھوں نے شمعون نام ایک کرینی جو دہات سے آتا تھا، پکڑ کے صلیب اس پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے لے چلے۔" (لوقا۔ ۲۳: ۲۶)

روایتیں بیان ہو چکیں۔ اب ایک بار پھر چشم تصور سے کام لیجئے مجرم کا یہ ہم قوم وہم وضع صلیب پیٹھ پر لادے سولی گھر کے دروازہ پر پہنچا پہرہ بدلا گیا۔ اب چارج جیل کے رومی سنتریوں اور پہرہ داروں کا شروع ہوا۔ وہ یقیناً اسی کو مجرم سمجھے۔ اور نہ سمجھنے کی وجہ کیا تھی۔ صلیب کی لکڑی مجرم ہی کی پیٹھ پر لدی ہوئی تھی۔ ہمیشہ سے اسی علامت کے عادی تھے۔ عدالت کے رومی سپاہی اپنا بیگار ان پر ٹال جیل والوں کا کام خود جیل والوں پر ڈال، معاً رخصت ہو گئے انھیں کیا پڑی تھی شناخت وتحقیق کی مزید زحمت میں اپنے کو مبتلا رکھتے۔ شام ہو ہی رہی تھی جیل کے سنتریوں نے جھٹ پٹ اسی کو سولی پر چڑھا دیا۔۔۔۔ یسوع ناصری یوں بھی دشمنوں کے پنجے سے بار بار نکل چکے تھے، اور اب کی تو تائیدی اسباب بھی اس کثرت سے ان کے حق میں جمع ہو گئے تھے ۔۔ غرض وہ پکڑا دھکڑا ہوا یہودی سولی پر چڑھا دیا گیا۔ وہ چیخا چلایا، جیل کے رومی افسر اور سنتری اس کی زبان سے ناواقف۔ قدرۃً یہی سمجھے کہ مجرم کے آخری وقت کا جزع وفزع ہے۔ اور پھر ہزاروں کے ہجوم وہنگامہ میں اسکی آواز خود یہود میں سے کتنوں کے کان میں پڑی ہوگی اور کتنوں نے ادھر توجہ کی ہوگی! یہود

دھوکے میں پڑے رہ گئے! وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ حقیقت حال ان پر مشتبہ ہو کر طلسم بن کر رہ گئی۔

قدیم نصرانیوں کی گواہی:

گمان نہ گزرے کہ خیال تمام تر نیا، اور نظریہ یکسر نو آفریدہ ہے۔ مسیحیوں کے نہیں، نصرانیوں کے قدیم فرقوں میں ایک فرقہ Basilians (بیسلیہ) کا گزرا ہے کوئی دوسری صدی مسیحی کے شروع میں (اس کے بانی کا زمانہ تقریباً ۱۲۵ء مانا گیا ہے) ان کے ہاں اس عقیدہ کی تصریح موجود تھی کہ مصلوب حضرت مسیح نہیں ہوئے بلکہ شمعون کرینی! (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۳ صفحہ ۱۴۶ اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں ایک قدیم فرقہ کا عقیدہ یہ لکھا چلا آرہا ہے کہ۔

"غلطی سے مصلوب شمعون کرینی ہو گیا۔ اور حضرت مسیحؑ اس کی شکل اختیار کئے ہوئے پاس ہی کھڑے ہوئے ہنستے رہے۔"

(جلد ۴۔ صفحہ ۸۳۳)

آج کی مسیحیت کی ساری زندگی ہی حضرت مسیحؑ کی مصلوبیت اور صلیب پر وفات اور دوبارہ جی اٹھنے کے عقیدہ سے وابستہ ہے لیکن قدیم نصرانیت، ابتدائی صدیوں والی، صاف لفظوں میں قائل تھی۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ کی!

عالمگیر دعوت:

قرآن بیان کرتا ہے اور تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اسلام سے قبل

جتنے بھی پیمبر آئے، سب اپنی یا دوسری کسی ایک ہی قوم کی جانب، اپنے یا دوسرے کسی ایک ہی ملک کے لئے۔ بائبل میں بھی ذکر صرف اسرائیلی انبیاء کا آتا ہے جو قوم اسرائیل کے لئے آئے۔ یا پھر ان چند انبیاء کا جو اس قوم کے اسلاف اور مورثوں یا عزیزوں میں تھے۔ حضرت ہودؑ صرف قوم عاد کے لئے تھے۔ ہندوستان سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ حضرت یونسؑ نینوا والوں کے لئے تھے چین سے انہیں علاقہ نہ تھا۔ حضرت مسیحؑ کا حلقہ اصلاح یہود تک محدود تھا، جین اور پارسی، بودھ اور ہندو مذہب ان کے قلمرو سے باہر تھے۔ اسلام نے رہبر عالم کے پیکر میں آکر اس قاعدۂ عام کو توڑ دیا۔ اور قرآن نے آکر صاف صاف دعویٰ کر دیا کہ میرا پیام کل دنیائے انسانیت کے لئے ہے، میری مخاطب ساری نسل آدم ہے۔ لیکن اسلام تو خود مدعی انبیاء قدیم کی سنّت پر چلنے اور قائم رہنے کا ہے، پھر اس اہم ترین باب میں، خود دائرہ دعوت کے باب میں، یہ جدت، یہ ندرت، یہ "بدعت" کیسی؟ چاہئے تو یہ تھا کہ اس کی بھی دعوت مخصوص رہتی اہل حجاز یا زیادہ سے زیادہ اہل عرب کے ساتھ اور اس کا پیام محدود رہتا نسل اسمٰعیل کے لئے۔

مسئلہ کے سمجھنے کے لئے ایک اجمالی نظر دنیائے قدیم کے نقشہ پر کر جائیے ہر ملک دوسرے ملک سے کٹا ہوا، ہر قوم دوسری قوم سے بچھڑی ہوئی ہر سرزمین اپنے مخصوص جغرافی و طبعی حدود کے اندر سمٹی ہوئی، سکڑی ہوئی، پہاڑ ہیں تو ناقابل گزر، دریا ہیں تو ناقابل عبور، ندی نالوں کو پار کرنا دشوار، بلکہ برسات کے موسم میں تو کہنا چاہئے کہ محال اور بحر، بحیرہ یا سمندر کا تو خیر نام ہی نہ لیجئے، کوئی ایسا ہی شدید سبب دشمنی کا اور قومی محرک فوج کشی کا پیدا ہو گیا جب تو خیر،

ورنہ ہر خطہ زمین کی جو قدرتی چار دیواری بن گئی، بس وہ قوم اسی کے اندر محصور اور گویا نظر بند[1]۔ مسافروں کا آنا جانا تو الگ رہا، باہر سے خبر تک کے آنے کا انتظام نہیں، اور ڈاک کا موجودہ مفہوم تو گویا کسی کے ذہن ہی میں نہیں۔ مہینوں میں کوئی باہمت قافلہ، برسوں میں کوئی جیوٹ والا سیاح آنکلتا، تو ایک نعمت ہاتھ آجاتی، اور تھوڑی بہت خبریں آس پاس کے ملکوں کی معلوم ہو جاتیں۔ مشرق و مغرب کا فاصلہ رکھنے والے دور دراز ملک تو اتنے سہارے سے بھی محروم۔ خود ایک ہی ذرا بڑے ملک کے اندر ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا، وہاں کی خبریں لانا، وہاں اپنا پیام پہنچانا کام صرف ہمت وروں کا، نصیبہ والوں کا تھا۔ اور تو اور کسی باقاعدہ سڑک کا وجود بھی سنہ ۳۰۰ ق م سے قبل کم از کم یورپ میں تو نہیں ملتا۔

اس صورتحال کو وضاحت کے ساتھ ذہن میں لاکر سوال کیجئے کہ کسی عالمگیر پیام نبوت کے امکانات ہی اس وقت کیا تھے؟ عالمگیر نہ سہی ایک براعظم کو بھی دوسرے براعظم سے ملانے والی، جوڑنے والی اس وقت کون سی راہیں، سڑکیں تھیں؟ براعظم کو بھی چھوڑئیے، ہندوستان، چین، روس جیسے لق و دق کسی ایک ہی ملک کے ایک گوشہ کو دوسرے گوشہ سے جڑے رکھنے کی صورت تھی؟—— اس وقت تو حالات تکوینی کے لحاظ سے عین تقاضا ہی حکمتِ تشریعی کا یہ تھا کہ پیام اور پیامبری کو محدود رکھا جاتا چھوٹے چھوٹے خطوں اور مختصر علاقوں کے اندر

---

[1] بلکہ اس وقت کی بعض ترقی یافتہ قوموں نے تو اس علٰحدگی اور کنارہ کشی میں غلو و مبالغہ سے کام لیکر اپنے افراد کے لئے باہر کا سمندری سفر حرام کر دیا تھا، مثلاً اہل ہند نے۔

اور یہی ہوا۔

لیکن رفتہ رفتہ اسی دنیا کے موسم نے پلٹا کھایا۔ مشینی دور کا آغاز ہوا اور اس نے گویا ملکوں اور اقلیموں کی طنابیں کھینچ کر رکھ دیں۔ فاصلہ کا لفظ اب بے معنی ہو گیا، اور کوئی مقام پرانے معیار سے، اب کہنا چاہئے کہ کہیں سے دور نہیں رہا۔ پہلے باقاعدہ سڑکیں بننا شروع ہوئیں، تیز رفتار گھوڑوں، سانڈنیوں کی نسلیں پرورش پانے لگیں۔ ڈاک اور ہرکارے کے تصور سے دماغ آشنا ہونے لگے۔ نئی نئی سواریاں، بگھیوں، ٹمٹموں، شکرم گاڑیوں کے نام سے وجود میں آنے لگیں۔ پھر اس خشک زمین پر ریل کی پٹریاں بچھنے لگیں۔ پہلے دخانی اور پھر برقی قوتوں کے قابو میں آجانے سے ریل، لاری، ٹریم، موٹر سائیکل، خدا جانے کتنی اور کیسی کیسی صبا رفتار سواریاں وجود میں آگئیں۔ اُدھر ڈونگیا کشتیوں نے پہلے بادبانی اور پھر دخانی جہازوں کی شکلیں اختیار کرنا شروع کیں۔ اور بڑے بڑے عظیم الشان جہاز سمندر کا جگر چیر چیر کر چلنے اور دوڑنے لگے۔ مشرق کے میوے مغرب میں ڈھیر ہونے لگے اور شمال کے سودے جنوب میں بکنے لگے۔ ڈاک نے سینکڑوں میل پر رہنے والوں کی خیریت دنوں بلکہ گھنٹوں میں سنا دی۔ تار نے ہزاروں میل کی خبر منٹوں میں منگا دی۔ ٹیلیفون نے جنوب کے ڈانڈے شمال سے ملا دیئے، اور اب ریڈیو نے مشرق کی آواز مغرب میں پہنچا دی۔ غرض اب ہر ملک کھنچ کر دوسرے سے اتنا قریب آگیا کہ گویا ایک بڑے شہر کے دو محلے ہیں۔ دنیا کا رقبہ گویا سمٹ گیا۔ کرہ کا قطر گویا سکڑ گیا۔ پریس کی ایجاد نے کتابوں، رسالوں، اخباروں کی بھرمار نے سینما کی گرم بازاری نے ریڈیو

کی محفل آرائی نے اور سب سے بڑھ کر طیاروں کی بلند پروازیوں نے، ایک نئی قسم کی وحدت میں گوروں اور کالوں کو زنگیوں اور فرنگیوں کو، حبشیوں اور تاتاریوں کو جکڑ دیا، جو بچھڑے ہوئے تھے، مل گئے۔ جو بکھرے ہوئے تھے جڑ گئے ایک نئی قسم کی یکرنگی کی لہر یہاں سے وہاں تک دوڑ گئی۔ انسانیت کی مستقل تقسیم اب ملکوں اور قوموں کی ٹکڑیوں، ٹولیوں میں نہیں رہی، نسل انسانی ایک ہی قبیلہ ایک ہی خاندان بن گئی، مختلف محلوں میں آباد!

حکمت کاملہ کا عین تقاضا اس دور کے لئے اب یہی ٹھہرا کہ پیام مختلف قوموں قبیلوں کے بجائے، اب صرف ایک آئے، سارے عالم انسانی کے لئے اور پیمبر کی دعوت کی مخاطب اب نہ قوم عرب ہو نہ قوم عجم، نہ بنی اسرائیل نہ بنی اسمٰعیل۔ بلکہ ساری نسل آدم ہو! قدرت کے انتظامات گرمی کے زمانے میں کچھ ہوتے ہیں سردی کے وقت کچھ، بہار کی رُت میں کچھ اور، خزاں کی فصل میں کچھ اور۔ نظام تکوینی کا دروبست، موسم کی ہر گردش کے ساتھ آفتاب یا زمین کے ہر چکر کے ساتھ خود بھی بدلتا رہتا ہے ـــــ عالم اور اہل عالم کے ماحول کے اتنے بڑے عظیم الشان انقلاب کے بعد لازمی تھا کہ طریق پیام و پیامبری بدلے۔ اور تشریعی دعوت اس تکوینی نظام نو سے مطابقت اختیار کرے! گویا وہی قانون حکمت جس کا تقاضا مدت دراز تک، ہزارہا سال تک یہ رہا کہ نبوت، نسلی، قومی، ملکی ہوا کرے۔ ٹھیک اسی قانون حکمت کے ماتحت یہ لازمی ہوگیا کہ اب جو پیمبری ہو۔ عالمگیر ہو۔ اور جو کتاب اور پیام آئے وہ نوع انسان کے کسی جزو کے لئے نہیں نوع انسان کے لئے ہو۔

لیکن قدرت کے نظام تکوینی کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ اصل ضرورت کے پیش آنے اور محسوس ہونے سے قبل ہی اس کے متعلق انتظامات ہر طرح کے ہو جاتے ہیں۔ پیاسا انسان بعد کو پیدا ہوا، بہتے ہوئے دریا، ابلتے ہوئے چشمے اس کی پیاس بجھانے کو مدتوں قبل سے وجود میں آچکے تھے۔ دیکھنے والی آنکھ بعد کو کھلی، روشنی پیدا کرنے والی، روشنی پھیلانے والی کرنیں بہت قبل سے اندھیرے کو اجالا بنائے ہوئے تھیں، دوڑنے کی مشق انسانی ٹانگوں نے بہت بعد کو کی، پیشوائی کے لئے کھلے ہوئے میدان مدتوں قبل سے حاضر تھے۔ انسان کے تپلے کے لئے مٹی کا خمیر بھی ابھی تیار نہیں ہوا تھا کہ سورج اور چاند، ہوا اور ستارے، دریا اور پہاڑ، چرند و پرند سب اس کی خدمت کے لئے مستعد اور کمربستہ خلعت وجود سے مشرف خدا معلوم کتنی صدیوں اور کتنے قرنوں قبل سے ہو چکے تھے۔

مخلوق کی ضرورتوں کا اندازہ داں خالق سے بڑھ کر، اور مظاہر فطرت کے لئے وقت و ساعت کا مصلحت شناس فاطر کائنات سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے؟ ریل اور تار کی ایجاد میں ابھی صدیوں کا عرصہ باقی تھا ٹیلیفون اور ریڈیو کے خوابوں سے ابھی بشر کا دماغ بیگانہ تھا۔ چین اور عرب ابھی اپنے درمیان بعد المشرقین ہی سمجھ رہے تھے کہ ندا کرنے والے نے بے دھڑک پکار دیا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ وقت آگیا اے آدم کے فرزند و خدائی پروگرام ہیں، کہ تمھیں ایک کامل و مکمل دین، ہر ضرورت کے لئے کافی اور ہر ماحول کے مطابق، دیدیا

جائے، چنانچہ دیا جارہا ہے اور تم سب کے ہاتھ میں بلا امتیاز رنگ و نسل، بلا تفریق حال و مستقبل، ایک نظام نامہ پہنچایا جارہا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ ہر پہلو سے متعلق، جامع مکمل، ہمہ گیر اور ناقابل نسخ و تبدیل ہر آب و ہوا کے لئے ہر طول البلد کے لئے، ہر عرض البلد کے لئے، یہ قائم رہے گا قیامت تک، اور اسی چشمۂ ہدایت سے استفادہ کرتے رہیں گے، غلام و آزاد، شہری و دیہاتی، مشرقی اور مغربی، گورے اور کالے! ـــــ الیوم والی آیت بڑے دعویٰ کا اعلان ہے انسان کی بنیادی وحدت کا اعلان ہے۔ اور یہ اعلان اس وقت ہوا جب کہ یہ حقیقت وقت کے بڑے بڑے مفکروں، فلسفیوں، حکیموں سب کی نظر سے مخفی تھی۔ قرآن والوں کو کسی نافہم کے اس طعن سے ہرگز مرعوب نہ ہونا چاہئے کہ آیت انسانی آزادی پر پابندی لگا رہی۔ اور اسے محدود کئے دیتی ہے۔ جھجکنے کے بجائے انھیں اس بے مثل و بے نظیر آیت کے وجود پر فخر کرنا چاہئے۔ اور داد دینا چاہئے اس یہودی کی حقیقت سنجی کی، جو آیت کو سن کر بول اٹھا تھا کہ کہیں ہماری کتاب میں ایسی آیت نازل ہوئی ہوتی تو ہم تو اس دن کو یوم عید یوم جشن بنا لیتے!

سمت پرستی ایک مستقل شرک:

سورہ بقر کی آیت ۱۷۷ اور اس کے رکوع ۲۲ کی پہلی آیت کا آغاز یوں ہوتا ہے:-

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ
الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ الخ

ترجمہ: نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے چہروں کو پھیر لو (نماز کے وقت)
مشرق اور مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے
اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر وغیرہا۔

سیاق نماز اور استقبال قبلہ کا ہے۔ اب چونکہ ہر نماز پڑھنے والا نماز پڑھتے وقت بہرحال کسی نہ کسی سمت ہی اپنا رخ رکھتا ہے۔ بلکہ متعین طور پر یوں کہئے کہ نجد، عراق، ایران، افغانستان، بلوچستان، ہندوستان، برما، تبت، چین وغیرہا کے نمازیوں کے منہ تو ہمیشہ مغرب کی جانب رہتے ہیں، اور مصر، طرابلس، حبشہ مراقش وغیرہ کے نمازیوں کے منہ ہمیشہ مشرق کی جانب۔ اس لئے قدرۃً اہل تفسیر کو یہ الجھن پیش آئی، کہ قرآن ایسی بدیہی چیز سے انکار کیسے کر رہا ہے؟ اور یہ اعلان کس طرح کر رہا ہے کہ نیکی یا عبادت یہی نہیں کہ نماز میں رُخ فلاں فلاں سمت کیا جائے، درآنحالیکہ مشاہدہ ہے کہ ہر نمازی اپنا رخ کسی نہ کسی سمت کی جانب رکھتا ہی ہے۔

اسی دشواری سے بچنے کے لئے کسی نے یہ کیا کہ برّ کو کمال برّ پر محمول اور نیکی کو کمال نیکی کے ساتھ مقید کر دیا۔ یعنی روح عبادت، یا کمال عبادت یا مغز عبادت یہ نہیں کہ منھ فلاں فلاں سمت کیا جائے، بلکہ اصل عبادت تو یہ ہے کہ عقائد درست کیے جائیں، اللہ اور فرشتوں پر ایمان رکھا جائے اور کسی نے مراد لی، کہ نیکی صرف یہی نہیں کہ منھ فلاں سمت رکھا جائے۔ بلکہ مقدم چیز یہ ہے کہ عقائد کو درست کیا جائے وغیرہا ـــــ لیکن قرآن کی اصل عبارت بالکل بے غبار اور ان تکلفات و تاویلات کے بغیر بھی بالکل صاف اور بے داغ ہے۔

مغالطۂ ذہنی کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ نمازی کسی نہ کسی رُخ کھڑا ہوتا ہی ہے اور قبلہ رُخ ہونا نماز میں فرض عین ہے۔ اس لئے ذہن میں استقبال قبلہ اور استقبال سمت کا مفہوم ایک قرار پا گیا۔ اور قبلہ رخی مرادف ٹھہر گئی سمت رخی کے! حالانکہ دونوں چیزیں بالکل الگ، اور ایک کا مفہوم دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ قرآن یہاں جس چیز کی عبادت ہونے، نیکی سمجھے جانے کی نفی کامل کر رہا ہے —— الفاظ یاد رکھئے، لَيْسَ الْبِرَّ۔ نیکی یہ ذرا سی بھی نہیں —— وہ "سمت رخی" ہے، اور جس چیز کو اس نے واجب قرار دیا ہے وہ "قبلہ رخی" ہے اور بچہ بچہ جانتا ہے کہ قبلہ یا کعبہ کسی سمت کا نام نہیں! —— سمتیں تو معلوم و معروف کل یہی چار ہیں۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، اور یا پھر انہیں کے مرکبات مثلاً شمال و مشرق، جنوب و مغرب وغیرہ۔ کیا قرآن نے ان میں سے کسی مفرد یا مرکب سمت کو قبلہ قرار دیا ہے؟ ان میں سے کسی جانب رُخ کرنے کا حکم دیا ہے؟ نہیں، بلکہ بدیہی تو یہ امر ہے کہ ہر نمازی سمت سے بالکل بے پروا ہو کر اپنا رخ ایک متعین مقام، ایک متعین مکان، ایک متعین عمارت کعبہ نامی کی جانب کئے ہوئے ہے! یمن والوں کو شمال کی جانب اور شام والوں کو جنوب کی جانب سجدہ کرتے کس نے نہیں دیکھا؟

قرآن نے قبلہ تو صرف ایک متعین عمارت کو مقرر کیا ہے، اور وہ جہاں سے جس جانب بھی پڑے۔ اور یہی واقعہ ہے کہ وہ کہیں سے شمال میں پڑتا ہے، کہیں سے جنوب میں، کہیں سے مشرق میں، کہیں سے مغرب میں کہیں سے شمال و مشرق کے گوشہ میں۔ کہیں سے جنوب و مغرب کے زاویہ میں! ——

وہی مسافر جس نے عصر کی نماز سواری کے رُخ پر پڑھی تھی، ریل یا جہاز کے مڑ جانے سے مغرب کی نماز سواری کے پہلو یا بازو کی جانب پڑھے گا، اور عشاء کی نماز سواری کے ایک بار پھر مڑ جانے کی بنا پر پھر اسی رُخ کی طرف! تیز رفتار ریلوں میں تو بارہا اتفاق یہ ہوا ہے کہ نماز شروع کی ہے انجن کے رخ پر، لیکن ابھی نماز تمام نہیں ہونے پائی ہے کہ ریل کا رخ بدل گیا ہے، اور اب نمازی کا رخ بجائے انجن کی طرف ہونے کے گاڑی کے داہنے یا بائیں ہو گیا ہے! تو مشاہد کسی سمت کی جانب رُخ کرنا نہ ہوا۔ مشاہد تو اس کے برعکس یہ ہے کہ نمازی رُخ کسی بھی متعین سمت کی جانب نہیں کرتا۔

اس مقالہ کے سامعین (اور اس کے چھپ جانے پر اس کے ناظرین) میں سے اکثر نمازی ہوں گے۔ نماز کی نیت باندھتے وقت آپ کو خیال پورب پچھم، وغیرہ کسی سمت کا بھی آتا ہے؟ یا جیسا آپ زبان سے کہتے جاتے ہیں، "منھ میرا طرف کعبہ شریف کے" خیال والتفات کعبہ ہی کا رہتا ہے؟ ارادہ تو آپکا یقیناً صرف کعبہ کی جانب توجہ کا رہتا ہے۔ اور یہ محض تکوینی اتفاق ہے کہ کعبہ کبھی آپ سے مشرق میں پڑ جاتا ہے، کبھی مغرب میں، کبھی اِس سمت، کبھی اُس سمت آپ کے قصد ارادہ و نیت کو ہرگز کوئی دخل سمت و تعین سمت کے باب میں نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ شرک کی جو بیشمار قسمیں دنیا میں رائج رہ چکی ہیں اور اب تک ہیں، پرستاران توحید کو نہ ان کا احساس ہے نہ اندازہ۔ قرآن اپنے بلیغ انداز میں تردید ان میں سے ایک ایک خفی سے خفی صورت کی بھی کرتا گیا ہے۔ مفسر

غریب، کیسا ہی صاحب تحقیق ہو، بہر حال ایک محدود ہی علم و نظر رکھنے والا بندہ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ دنگ و حیران رہ جاتا ہے کہ یہ تیر آخر کس نشانہ پر لگایا جارہا ہے شرک کی انھیں غیر معروف لیکن نہایت وسیع صورتوں میں ایک صورت کا نام سمت پرستی یا Direction worship ہے یعنی کوئی ایک سمت (زیادہ تر سمتِ مشرق) مقدس فرض کرلی گئی اور پوجا اسی سمت کی شروع ہوگئی، اور غضب یہ ہوا کہ بعض آسمانی مذاہب بھی جب رفتہ رفتہ شرک کے شکار ہونے لگے تو یہ سمت پرستی والا شرک بھی ان کے عقائد کا جزو بن گیا۔ قرآن کی ہمہ بین، ہمہ گیر نظر، ہر مفسر و شارح کی گرفت سے بالاتر، اس دقیقہ پر بھی پہنچی، اور اس نے صاف اعلان کردیا کہ تم جو مشرق پرستی اور مغرب پرستی میں پڑے ہو، یہ مشرق پرستی اور مغرب روئی اپنے اندر ذرہ بھر بھی عمل خیر نہیں رکھتی، یہ ہر گز اعمال خیر میں سے نہیں، دین صحیح سے اسے مطلق سروکار نہیں!

مشرق پرستی و مغرب پرستی:-

مسیحی مذہب سے قدیم تر، یونان کا قدیم مذہب ہوا ہے، اور مسیحی مذہب اپنی موجودہ ہیئیت میں بڑی حد تک اس کا خوشہ چین بھی ہے۔ اس یونانی مذہب میں دیوتا یا معبود دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک قسم کے اولمپیائی olym-pian gods کہلاتے تھے۔ ان کا مسکن سمت مشرق تھا۔ اور اسی لئے خود یہ سمت مقدس ہوگئی تھی۔ ان دیوتاؤں کے مندر مشرق رویہ ہوتے تھے۔ اور اہل یونان اپنی پوجا پاٹ اسی رُخ ہو کر کرتے تھے۔ دیوتاؤں ہی کی دوسری قسم، کیتھولک Catholic gods کہلاتی تھی۔ یہ دیوتا، پہلی قسم کے برعکس

سمت مغرب میں رہتے تھے۔ اور ان کے پجاریوں کے عقیدہ میں تقدس سمتِ مغرب میں سمٹ آیا تھا۔ اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (جلد ۱۲ ص ۶۱۸) کے ایک حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو مذہب میں شرف تقدس سمت جنوب و مشرق کو حاصل ہے۔ آفتاب پرست قومیں جتنی بھی گزری ہیں سب نے مقدس سمت مشرق کو مانا ہے۔ موجودہ مسیحیت جو بڑی حد تک معجون مرکب ہے یونانی شرک اور رومی شرک کا، اس نے یہ جہت مشرق کا تقدس بھی اپنے اندر انھیں یونانیوں اور رومیوں سے لے کر حلول کرلیا ہے چنانچہ Orientation مشرق رخی مسیحیوں کے ہاں کی مخصوص مذہبی اصطلاح ہے۔ ان کے گرجے اسی رُخ پر تعمیر ہوتے ہیں۔ شامی عیسائی اور فرقہ اسینین والے Essenes اپنی نمازیں اسی رُخ پر ادا کرتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا وغیرہ میں اس پر مفصل معلومات موجود ہیں۔

بعض مشرک قوموں نے ایک فلسفہ یہ گڑھا کہ جس طرح آفتاب حیات کا مظہر اور آفرینش کا دیوتا ہے، اسی طرح رات کی تاریکی موت کا دیوتا اور ہلاکت کا مظہر ہے۔ اس لئے غروب آفتاب کی سمت، یعنی مغرب، موت و ہلاکت کے دیوتا کا مسکن ہے اور اس لئے مقدس سمت مشرق نہیں، بلکہ مغرب ہے۔ ٹایلر کی مشہور و ضخیم کتاب "ابتدائی تہذیب" Primitive Culture اور فن کی دوسری کتابوں میں تصریحات موجود ملیں گی ـــــ غرض یہ کہ دنیا میں مشرق پرستی خوب زوروں کے ساتھ رہ چکی ہے، اور اس کے بعد مغرب پرستی بھی۔ اور اس کے بہت بعد کسی نہ کسی درجہ میں دوسری سمتوں کا تقدس بھی۔

قرآن نے ضرب اسی عقیدۂ سمت پرستی پر لگائی۔ اور یونانی حکماء، رومی فلاسفہ، مسیحی فضلاء سب کے مقابلہ میں اعلان کیا، کہ سمت کوئی بھی مقدس نہیں سمت پرستی سراسر خرافات پر مبنی ہے۔ سمتیں سب برابر تمھیں جو حکم دیا جارہا ہے، وہ تو صرف ایک مرکز کی جانب متوجہ ہونے کا ہے کہ اس سے قوم میں یک جہتی، مرکزیت پیدا ہوگی، اور اسی کا نام استقبال قبلہ ہے، خواہ وہ قبلہ نمازی کے جس سمت بھی واقع ہو! —— یہیں سے بعض دوسری آیتیں بھی صاف ہوئی جاتی ہیں۔ مثلاً لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ یعنی سمتیں، جہتیں، سب اللہ ہی کی مخلوق وملک ہیں۔ کسی میں نہ کوئی الوہیت ہے نہ تقدس۔ اللہ نہ پابند ہے کسی جہت کا نہ محدود ہے کسی سمت کے ساتھ، تم رُخ جدھر بھی کروگے، اللہ ہی کا نور پاؤگے۔ باقی ایک خاص عمارت، ایک مخصوص مکان کو جو مرکز توجہ قرار دیا جارہا ہے۔ وہ امت میں وحدت ملت میں یکجہتی اور دوسرے مصالح سے ہے۔ اور سمت پرستی کو تقویت پہنچانے والا نہیں، اس پر ضرب کاری لگانے والا ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب۔ لیکن اللہ کے نہیں، تو اور کس کے ہوتے؟ اتنی کھلی ہوئی اور صاف حقیقت کو اس صراحت سے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

ضرورت تھی صاف اور کھلی ہوئی حقیقت تو یہ اب قرآن کے نزول کے بعد، اور قرآن کے ماننے والوں کو معلوم ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے یہ کھلی ہوئی حقیقت تھی ہی کب؟ مصری، ہندی، رومی قوموں نے کہا کہ مشرق سورج دیوتا

کے طلوع کی جگہ ہے۔ اس لئے یہ جہت خود بھی مقدس ہے رومیوں کی تقلید میں مسیحی بھی آفتاب پرستی کے دوسرے عنصروں کی طرح مشرق کے تقدس کے قائل ہوگئے، اور مشرق رخی orientation وغیرہ کے مسئلے اپنے ہاں گڑھ لئے لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ان سب کے خلاف اعلانِ جہاد ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ان میں تقدس اور شانِ الوہیت ہونا تو کجا، دوسروں کا حاجت روا ہونا تو الگ رہا۔ جہت مشرق وجہت مغرب خود اپنی جگہ پر بھی تو آزاد، مطلق العنان، خود مختار نہیں۔ اللہ کے مخلوق ہیں۔ مغلوب ہیں، محکوم ہیں۔ اپنے وجود میں اس کے محتاج، اپنی بقا میں اس کے محتاج اپنے قیام میں اسی کے قاعدوں، ضابطوں کے تابع! —— نام انھیں دو سمتوں کا صراحت کے ساتھ اس لئے لیا گیا کہ یہی دو سمتیں سب سے زیادہ شرک پرور رہی ہیں، مشرکانہ عقائد کی سب سے بڑی امید گاہیں رہی ہیں۔

عقیدۂ تجسیم پر ضرب:

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اے خدائے واحد کے پرستار اور شرک وشبۂ شرک سے بیزار مسلمانو! کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا بھی پابند ہے کسی سمت کا مقید ہے کسی جہت کے ساتھ۔ تم جدھر بھی اپنا منہ کرو، نماز، دعا، عبادت کے لئے بس خدا اسی طرف ہے، وہ پاک ہے ہر سمت سے۔ منزہ ہے ہر جہت سے۔ اس کی ذات پاک کے تجلیات ہر طرف ہیں، سب کہیں ہیں، جدھر بھی رُخ کروگے، جلوہ اسی کا پاؤگے۔ کون سی جہت، کون سا مکان، کون سا گوشہ اس سے خالی ہے؟ —— یہ سب تردید ہو رہی ہے عقیدہ تجسیم Anthropo-morphism

کی۔ وہی عقیدۂ تجسیم، جو جزو لاینفک رہا ہے نہ صرف وحشی قوموں کے مذہبوں کا۔ بلکہ جہاں تک انگریزی میں لکھے ہوئے تذکرۃ الادیان سے پتہ چلتا ہے۔ چینی مذہب کا، مصری مذہب کا، کلدانی مذہب کا، ہندی مذہب کا، یونانی مذہب کا، رومی مذہب کا، مسیحی مذہب کا، خصوصاً اس کی لاطینی شاخ کا، اور سب سے بڑھ کر حیرت یہ ہے کہ خود اسرائیلیوں کے بھی مذہب توحید کا۔

آیت کے خاتمہ کے الفاظ ہیں، اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ اللہ تو خود ہی انتہائی وسعت رکھنے والا ہے، ہر شے پر وسعت رکھنے والا ہے۔ ساری وسعتیں خود اس کے اندر سمائی ہوئی ہیں، وہ کس وسعت کے اندر سما سکتا ہے؟ ساری سمتوں، جہتوں کو تو وہ خود ہی احاطہ میں لئے ہوئے ہے اس کا احاطہ کون سمت، کون جہت کر سکتی ہے؟ وہ کس طرح کسی جہت سے مقید، کسی سمت سے محدود ہو سکتا ہے؟ ساتھ ہی وہ انتہائی علم والا بھی ہے کامل علم رکھنے والا ہے مخلوق کی ہر ضرورت کا، کائنات کی ہر مصلحت کا۔ وہ اپنے اس علم کامل کے لحاظ سے جس مکان کو چاہے قبلہ مقرر کر دے، جس عمارت کو چاہے مرکز توجہ ٹھہرا دے سارے عبادت گزاروں کا۔ اس مرکزیت و یکسوئی کے تعین میں اصلاً دخل نہ کسی جہت کے تقدس کا ہے نہ کسی سمت کے خدائی ہونے کا۔

خدا کا متبنیٰ :

آیت ۱۱۵ ختم ہو گئی سورۂ بقر کی۔ مسئلہ وہی صفات خداوندی کا چل رہا ہے۔ آیت ۱۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا

سُبْحٰنَهٗ۔ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے بنا رکھا ہے ایک بیٹا یہ کہنے والے، اس قول کے قائل کون ہیں؟ وسیع معنیٰ میں بہت سے اہل باطل مراد ہو سکتے ہیں، کہ خداوند تعالیٰ کی فرزندی کا عقیدہ بہت سی قوموں میں عام و مشترک ہے لیکن خصوصی معنی میں مراد انھیں سے ہے جو اپنے کو مسیحی کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے۔ "خدا کے ایک بیٹا ہے" نہیں۔ الفاظ قرآنی ہیں۔ اتخذ اللّٰہُ وَلَدًا، خدا نے رکھا ہے ایک بیٹا —— قرآن آخر خدا کا کلام ہے، غریب مفسر، غریب شارح، غریب بندہ، ہر ہر اشارہ، ہر ہر تلمیح کو کہاں تک اپنے فہم و ادراک کی گرفت میں لاتا رہے! —— مسیحیوں کا عام عقیدہ جو اس باب میں ہے، معلوم و معروف ہے۔ یعنی یہ کہ ایک تو خدا ہے، اور ایک خدا کا بیٹا ہے وہ بھی قدیم، یہ بھی قدیم، وہ بھی غیر مخلوق، یہ بھی غیر مخلوق، وہ بھی ازلی یہ بھی ازلی۔ لیکن انھیں مشرک مسیحیوں کے اندر، گو نسبتہً ان سے بلند تر، ایک فرقہ، قدیم و زبردست مسیحیوں کا ایسا بھی گزرا ہے جو کہتے تھے، کہ عیسیٰ مسیحؑ اصلاً خدا نہ تھے، اپنی سرشت کے لحاظ سے انسان ہی تھے، جیسے ہم آپ ہیں، البتہ روح القدس کی روحانیت کا فیضان ان پر شروع سے تھا اور اس کی شدت اس درجہ ہوئی کہ وہ ہمہ تن تقدس کے رنگ میں ڈوب گئے اور خدا نے جب ان میں خدائی رنگ اس نوبت پر پایا تو انھیں اپنا بیٹا بنا لیا، اپنی خدائی میں شریک کر لیا۔ اپنی تبنیت سے مشرف کر دیا۔

انگریزی میں اصطلاحی نام اس عقیدہ کا Adoptianism ہے اس کا ترجمہ "تبنیت" ہو سکتا ہے، اور اس فرقہ کو انگریزی میں Adoptionist

کہتے ہیں۔ مسیحیت کی قدیم تاریخیں اس فرقہ کے تذکرہ سے لبریز ہیں مسیحیت کی ابتدائی صدیوں میں اس فرقہ کا خاصا زور تھا۔ حال میں جرمن محقق ہارنک Haranck نے اپنی "تاریخ العقیدہ" History of Dogma میں تفصیل سے دکھایا ہے کہ ۱۸۵ء میں تھیوڈوٹس بازنطینی Theodotus of Byzantine نے اس عقیدہ کو روم میں خاص طور پر چمکایا تھا۔ خود اس پر تو ۱۹۵ء میں حکم تکفیر لگ گیا لیکن اس کے شاگرد ارٹیمن Arleman نے اس تعلیم کو جاری رکھا اور مشرق میں بریلیس بسطروی Bryllus of Bostia پولوس سموسطوی Paul of samosala اس کے علمبردار ہو گئے۔ یہاں تک کہ پادری ایریس Arius اور نسطوریئس Neslarins کے واسطے سے عین ظہور اسلام تک اس کا دم خم قائم رہا۔ اور آٹھویں صدی اور بارہویں صدی عیسوی میں پھر اس کا بار بار زور بندھا۔ شرک تثلیث کی اور صورتوں سے یہ صورت نسبتۃً خفی ہے۔ قرآن نے اشارہ اسی فرقہ کے عقائد کی جانب کیا۔ اور قرآن کی بلاغت معنوی کی داد دیجئے کہ ایک لفظ اتخاذ ولد، لاکر تاریخ مسیحیت کے کتنے اہم و وسیع باب کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔

مِلکیّت کاملہ :

سُبۡحٰنَہٗ تَعٰلٰی عَمَّا سُبۡحٰنَہٗ! خدائے پاک پاک ہے اس قسم کی مادی قرابتوں، رشتہ داریوں سے اسے ایک طرف خدا بھی کہے جاتے ہو، اس کی قدرت کا کلمہ بھی پڑھتے ہو، اور پھر محتاج سمجھتے ہو اسے اس کا، کہ وہ دنیا کے لاولد لوگوں اور لاولدی کے نقصانات محسوس کرنے والے انسانوں کی طرح، کسی کو گود

لے کر اپنی لاولدی کی تلافی کرے! یہ کیا لغو خیالی اور کیسی پریشان دماغی ہے بَلۡ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔ اس کا تو سب ہی کچھ ہے۔ اعلیٰ و ادنیٰ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے صحیح رشتہ اس کے اور اس کے مخلوقات کے درمیان مِلک کا ہے۔ وہ سب کا مالک سب اُس کے مملوک۔ جس سے جو چاہے کام لے۔ اسے ضرورت کیا کسی کو گود لینے کسی کو بیٹا بنانے کی؟ مِلک کا تعلق تو فرزندی و تبنیت کے تعلق سے کہیں زیادہ قوی موجود ہے۔ آخر اس کے لئے ممکن ہی کونسا ارمان ہے، کہ اس کے پورا کرنے کے لئے کسی کو متبنیٰ بنانے کی حاجت پیش آئے؟

کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ۔ سب اس کے آگے گردن جھکائے ہوئے ہیں۔ بڑے سے بڑے گردن کش بھی اطاعتِ اضطراری و طبعی پر مجبور، احکام شریعت سہی، قوانین تکوینی کی فرمانبرداری سے تو کسی کو بھی چارہ نہیں، بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اور یہ ہیبتناک آسمان اور لق و دق زمین، کہ بیسیوں قوموں کی پیشانیاں انھیں کے آگے زمین پر لگ گئیں، یہ نہ دیویاں ہیں نہ دیوتا نہ صاحب اختیار و صاحب تصرف۔ یہ تو خود مخلوق و مجبور، بے کس و بے اختیار ہیں۔ اللہ موجد ہے ان سب کا۔ لفظ "بدیع" خیال میں رہے۔ وہ انھیں نیست سے ہست کرنے والا ہے۔ عدم محض سے وجود میں لانے والا ہے۔ بغیر کسی آلہ کی مدد کے۔ بغیر کسی سابق الوجود مادہ کے بغیر کسی سابق الوجود نمونہ کے! وہ محض صانع یا کاریگر نہیں، کہ ایک نمونہ کو دیکھ کر اس کی نقل اصل سے ملادی، یا کوئی مادہ پہلے سے موجود تھا۔ اسے اپنی ترتیب اور ترکیب سے ایک خاص صورت

دے دی ـــــ اس ایک لفظ میں رد آگیا ان سارے مشرکانہ مذہبوں کا، جو خدا کو محض ایک صناع یا کاریگر کا درجہ دیتے ہیں۔ اور تردید ہو گئی ان سارے مشرک فلسفیوں کی جو ایک طرف خدا کو خدا بھی مانے جاتے ہیں، اور دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ روح کو قدیم اور مادہ کو غیر حادث قرار دیئے جاتے ہیں۔

قرآن کے اس قسم کے چھوٹے چھوٹے فقروں، مفرد لفظوں کی پوری قدر جبھی ہوتی ہے، جب دنیا کی باطل پرستیوں کی مثالیں اور نمونے تفصیل کے ساتھ نظر کے سامنے ہوں۔

نبی کا مفہوم قبل اسلام:

سورۂ مائدہ میں ایک جگہ آتا ہے۔ اِنَّآ اَنزَلنَا التَّوْرٰۃَ فِیھَا ھُدًی وَّنُورٌ یَحکُمُ بِھَا النَّبِیُّونَ الَّذِینَ اَسلَمُوا لِلَّذِینَ ھَادُوا۔ اس میں النَّبِیُّونَ کے ساتھ ٹکڑا جو اَلَّذِینَ اَسلَمُوا کا لگا ہوا ہے اس نے قدیم مفسرین کے لیے اچھی خاصی الجھن پیدا کر دی۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے توریت نازل کی، اس کے اندر ہدایت اور نور ہے، اسی کے مطابق وہ نبی جو اللہ کے مطیع تھے، یہودیوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے" ـــــ جو نبی اللہ کے مطیع تھے کیا معنی؟ کیا کوئی نبی ایسے بھی ہوئے ہیں، جو اللہ کے مطیع نہ ہوں، فرمانبردار ہونے کی جگہ نافرمان ہوں؟

اشکال اس بنا پر ہوا کہ ذہن کے سامنے تصور اس "نبوت" کا رہا، جو ایک اسلامی اصطلاح بن چکی ہے اور اس میں نبوت کے معنی لازمی طور پر نبوت الٰہی ہی کے ہیں۔ لیکن صاحب قرآن کو تو بہرحال معلوم تھا کہ یہود کے ہاں نبوت

کا یہ تخیل ہی نہیں۔ اُن کے سارے مذہبی ادب میں نبی کا لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی خبر دینے والا، پیشین گوئی کرنے والا، عام اس سے کہ اس کا تعلق خدا سے ہو یا شیطان سے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ صاحب کشف ہو۔ مشرک قوموں میں جو مرتبہ کاہن کا ہوتا ہے بس اسی سے ملتا جلتا منصب یہود کے ہاں نبی کا ہوتا ہے۔ صرف اس میں اشراقیت ہونا ضروری تھی جو بعض کو طبعاً و جبلۃً حاصل ہوتی ہے، اور بعض کو مشق و ریاضت سے حاصل ہو جاتی ہے۔ صداقت، حقانیت، روحانیت، تعلق باللہ، ملکۂ اصلاح خلق و تزکیۂ نفس سے اس کا بہرہ مند ہونا ہرگز ضروری نہ تھا۔ چنانچہ توریت میں ایک جگہ اور ضمناً و اجمالاً نہیں، متعدد جگہ اور صراحۃً، تفصیلاً ذکر ایسے نبیوں کا ملتا ہے، جو کفر کی دعوت دینے والے اور شرک کی طرف بلانے والے تھے۔

توریت کی کتاب استثنا میں ہے۔

"اگر تمھارے درمیان کوئی نبی یا خواب دیکھنے والا ظاہر ہو اور تمھیں کوئی نشان یا معجزہ دکھلاوے اور اس نشان یا معجزہ کے مطابق جو اس نے تمھیں دکھایا بات واقع ہو اور وہ تمھیں کہے آؤ ہم غیر معبودوں کی جنھیں تم نے نہیں جانا پیروی کریں اور ان کی بندگی کریں، تو ہرگز اس نبی یا خواب دیکھنے والے کی بات پر کان مت دھرو، اور وہ نبی یا خواب دیکھنے والا قتل کیا جائے گا۔" (۱۳: ۱۔۵)

اس میں صریحاً دعوت شرک و ضلالت دینے والے کو نبی سے تعبیر کیا گیا ہے، اور ایسے نبی کو واجب القتل قرار دیا گیا ہے۔

دوسرا اقتباس اسی کتاب استثنار کا اور ملاحظہ ہو :۔

"لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے کہ جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا، یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔ اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیوں کر جانوں کہ یہ بات خدا کی کہی ہوئی نہیں، تو جان رکھ کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے، اور وہ جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی، بلکہ اس نبی نے گستاخی سے کہی ہے، تو اس سے مت ڈر۔" (۱۸ : ۲۰ - ۲۲)

تیسرا اقتباس اس حقیقت کو پوری طرح واضح کئے دیتا ہے کہ بنی اسرائیل میں نبوت بالکل کہانت کی قسم کی ایک چیز ہو گئی تھی اور انبیاء اور کاہنوں کا درجہ ایک ہو گیا تھا یرمیاہ نبی اپنی سرگزشت کا ایک حصہ یوں سناتے ہیں۔

"تب میں نے کہا ہائے اے خداوند یہوو! کچھ انبیاء ان سے کہتے ہیں کہ تم تلوار نہ دیکھو گے، اور تم پر کال نہ آئے گا بلکہ میں اس مکان میں تم کو ایسی سلامتی دوں گا جو قائم رہے گی۔ تب خداوند نے کہا کہ انبیاء میرا نام لے کر جھوٹی نبوت کرتے ہیں، میں نے انھیں نہیں بھیجا اور حکم نہیں دیا نہ انھیں کہا۔ وہ جھوٹی رویا اور جھوٹا علم غیب اور بے اصل باتیں اور اپنے دلوں کی مکاریاں نبوّت کی طرح تم پر ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے خداوند یوں کہتا ہے ان نبیوں کی بابت جو میرا نام لے کے نبوّت کرتے ہیں جنھیں میں نے

نہیں بھیجا اور جو کہتے ہیں کہ تلوار اور کال سے ہلاک کئے جائیں گے اور جن لوگوں سے وہ نبوّت کرتے سو وہ کال اور تلوار کے سبب سے یروشلم کے کوچوں میں پھینک دیئے جائیں گے اور اُن کی جوروان اور ان کے بیٹے اور بیٹیاں اور ان کا گاڑنے والا کوئی نہ ہوگا کہ ان کی برائی اُن پر ڈالوں گا۔" (یرمیاہ-۱۴: ۱۳-۱۶)

کاہنوں ہی کی طرح یہ جھوٹے نبی بھی عذابِ الٰہی کے مستحق اسی دنیا میں ہوا کرتے تھے۔ اسی کتاب یرمیاہ میں ہے۔

"خداوند یوں کہتا ہے دیکھو میں اس سرزمین کے سارے رہنے والوں کو، ہاں ان بادشاہوں کو جو داؤد کے تخت پر بیٹھے اور کاہنوں اور نبیوں اور یروشلم کے سارے باشندوں کو مستی سے لبالب کروں گا اور میں ان میں سے ایک دوسرے پر بیٹوں اور باپوں کو ایک ساتھ ڈال دوں گا۔" (۱۳: ۱۳ و ۱۴)

حزقی ایل نبی کی کتاب میں بھی اس قسم کے بنے ہوئے نبیوں اور ان کی بیہودگیوں اور سزاؤں کا ذکر ہے۔

"اے آدم زاد اسرائیل کے بیٹوں سے جو نبوت کرتے ہیں ان کا مخالف ہو کر نبوّت کر، اور ان سے جو اپنے اپنے دل سے نبوّت کرتے ہیں، ان سے کہہ کہ خدا کا کلام سنو۔ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ بیہودہ نبیوں پر واویلا ہے جو اپنی ہی روح کی پیروی

کرتے ہیں، اور انھوں نے کچھ نہیں دیکھا، اے اسرائیل تیرے نبی ان لومڑیوں کے مانند ہیں جو اجاڑ مکانوں میں رہتیں۔ دھوکا اور جھوٹا شگون دیکھ کے کہتے ہیں کہ خداوند کہتا ہے اگرچہ خداوند نے انھیں نہیں بھیجا ہے اور اوروں نبی امید پیدا کرتے کہ سخن پورا ہو جائے گا۔ کیا تم نے باطل رویا نہیں دیکھی۔ کیا تم نے جھوٹی غیب دانی نہیں کی، اور بولتے ہو کہ خداوند نے کہا ہے کہ اگرچہ میں نے نہیں کہا۔ اور میرا ہاتھ ان نبیوں پر جو دھوکا دیتے ہیں اور جھوٹی غیب دانی کرتے ہیں۔" (حزقی ایل۔ ۱۳: ۱-۱۹)

یہ چند اقتباسات صرف نمونہ کے طور پر دیدئیے گئے۔ ورنہ اور بھی بہت سے اسی مفہوم و مضمون کے توریت میں مل جاتے ہیں اور جعلی نبی کی سزا بھی شریعت یہود میں یہ ہے کہ اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا جائے۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا۔ جلد۔۱۔ صہ۲۱۳ ک)

تاریخ بنی اسرائیل میں ایک ایسا دور بھی گزرا ہے کہ نبی کے بجائے "غیب بین" کی اصطلاح رائج تھی۔ توریت میں اس کی تصریح موجود ہے۔

"اگلے زمانے میں بنی اسرائیل کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی خدا سے مصلحت کرنے جاتا تھا تو کہتا تھا کہ آؤ ہم غیب بین کے پاس جائیں اس لئے کہ جواب نبی کہلاتا ہے آگے غیب بین کہلاتا تھا۔"

(۱۔ سموئیل۔۹-۹)

قرآن مجید نے انبیاء اسرائیل کے ساتھ الَّذِينَ أَسْلَمُوا کی قید لگا کر اسرائیلی

نبوت کی تاریخ کے دریا کو گویا کوزہ میں بند کر دیا، تفسیر کی ساری الجھنیں دور کر دیں اور اشارہ کر دیا کہ یہاں مراد سچے اور صحیح انبیاء ہیں۔ اسلامی اصطلاح والے انبیاء ہیں۔ غیب بین اور کاہن اور اسرائیلی اصطلاح والے انبیاء مراد نہیں۔

حضرات۔ صحبت بہت طویل ہو گئی، آپ کب تک سنتے جائیں گے یہ چند قدیم مسائل جدید روشنی میں محض نمونہ کے طور پر پیش کئے گئے۔ ابھی قرآنی مسائل بیسیوں نہیں، بلکہ پچاسوں شاید سینکڑوں کی تعداد میں ایسے اور ہیں کہ ان پر علوم جدید، اور تحقیق مزید کی روشنی اور پڑے تو مضمحل و مجروح ہونے کے بجائے وہ اور زیادہ نکھر آئیں گے۔ ان کے جوہر اور زیادہ چمک اٹھیں گے۔

(۲)

جدید قصص الانبیاء

(۱) ابوالبشر آدمؑ

دنیا بن کر تیار ہو چکی، زمین کا فرش اپنی رنگینیوں اور بوقلمونیوں کے ساتھ بچھ چکا ہے۔ آسمان کی چھت اپنی بلندیوں کے ساتھ قائم ہو چکی ہے۔ آفتاب اور ماہتاب کے ہنڈے روشن ہو چکے ہیں۔ تاروں کے ننھے مدت ہوئی کہ رات کے اندھیرے کو اجالے میں تبدیل کر چکے ہیں۔ گھوڑے، ہاتھی، مچھلی کچھوے، فاختہ، کبوتر، سارے جاندار زمین پر۔ سمندر میں، فضا میں، زندگی کی سانس لے رہے ہیں۔ دریا کی جگہ دریا موجوں کا لطف دکھا رہے ہیں۔ پہاڑ کی جگہ پہاڑ اپنی ہیبت دلوں میں بٹھا رہے ہیں، نور کے بنے ہوئے فرشتے، نار کے بنے ہوئے جنات، سب خلعت وجود سے مشرف ہو چکے ہیں۔ غرض مجلس کائنات ہر طرح آراستہ۔

انتظامات مکمل ہو چکے، تو اب حکمت کاملہ کو منظور ہوا کہ محفل میں قدم رونق محفل کے آئیں اور زمین پر نفاذ آسمان والے کے قانون کا شروع ہو۔ قانون تکوینی (Physical Law) تو شروع ہی سے نافذ تھا۔ اب منظور ہوا کہ سکہ قانون تشریعی (Moral Law) کا چلے۔ اضطراری تعمیل اول دن سے ہو رہی تھی۔ اب وقت اس کا آیا کہ تعمیل عقل و ارادہ کے ساتھ، قصد و اختیار کے ساتھ ہو۔ مخلوقات کی صف میں سب سے معزز سب سے مقرب فرشتے تھے ارشاد انھیں سے ہوا۔ کچھ خبر ہے؟ وجود میں ایک تازہ مخلوق آنے کو ہے۔ وہ روئے زمین پر ہمارا خلیفہ ہوگا، ہمارا قانون چلائے گا، فرشتے غیب داں نہ تھے لیکن بہر حال فہم و فراست کے توحصہ دار تھے ہی اور حاضر پر غائب کو قیاس کر ہی سکتے تھے۔ قوائے بشری کی ترکیب اور زمینی مخلوقات کی ضروریات و مقتضیات کا اندازہ لگا، دل میں سمجھے اور صحیح سمجھے کہ اس نئی مخلوق کی ذریات میں کچھ سرکش و غدار، عاصی و نافرمان ضرور ہی پیدا ہوں گے۔ بولے اور وفا سرشت بندوں کی طرح آقا پرستی کے جوش سے لبریز ہو کر بولے، کہ حضور والا! ہم خدام قدیم آخر کس دن کے لیے ہیں؟ جو بھی خدمت ہو ہمارے جسم وجان اس کے لئے حاضر ہیں؟ یہ نئے حضرت جو آرہے ہیں۔ نفس اور ارادہ بھی تو ساتھ لا رہے ہیں۔ آپس میں لڑیں گے، بھڑیں گے، جھگڑیں گے اور ایک دوسرے کا اور سرکار کا قانون توڑیں گے، طبع مبارک کی گرانی کے سبب بنیں گے۔ یہ منظر ہم جاں نثاروں سے کس دل سے دیکھا جائے گا"
جواب میں ارشاد ہوا کہ تمھاری خیر خواہی مسلّم لیکن تمھارا علم بہر حال محدود۔

تم نے وہی کہا جو تمھیں اپنی بصیرت کے مطابق نظر آیا، تمھیں کیا علم ہماری لامحدود حکمتوں کا، بے پایاں مصلحتوں کا؟ جو کام اس نئی مخلوق سے لیتے ہیں اس کو قویٰ بھی تو ملیں گے انھیں کے مناسب انھیں کے متناسب۔

خاموشی ملاء اعلیٰ پر چھا گئی۔ نار و نور دونوں سے الگ، دونوں کے خواص ترکیبی سے جدا، خاک کا ایک پتلا تیار ہوا۔ اور اس کے اندر روح الٰہی دم ہوئی۔ روح کا دم ہونا تھا کہ گیلی مٹی کا خمیر کیا ہوا اور اب خشک اور کھنکھناتا ہوا پتلا، دم کے دم میں جیتا جاگتا، دانا و بینا آدم بن گیا۔ سلسلۂ نسل انسانی کا مورث اعلیٰ، علوم و معارف سے لبریز، آخر خلیفۃ اللہ تھا نہ میں کیا لفظ بول گیا؟ اصل قصّہ کا سر رشتۂ بیان چھوڑ، چند لمحوں کے لئے ذرا اسی لفظ کو دوہرا لیجئے۔ اور اسی کی معنویت پر دھیان جما لیجئے۔ "خلیفۃ اللہ" کہ یہی حیثیت تو آدم کی اصلی اور اہم ترین حیثیت تھی۔ قرآن مجید میں جہاں خلقت آدم کا بیان پہلی بار آیا ہے، یہ نہیں وارد ہوا ہے کہ جب ہمیں نوع انسانی کی آفرینش منظور ہوئی، یا سلسلۂ بشری کا پہلا انسان پیدا کرنا منظور ہوا۔ بلکہ ارشاد ہوا ہے اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط

یعنی یاد کرو وہ وقت جب پروردگار نے فرشتوں سے کہا، کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں، آدم کو ابوالبشر مسلمانوں کے علاوہ یہود اور مسیحوں نے بھی مانا ہے۔ لیکن ملاحظہ ہو کہ بائبل میں یہ ذکر کس انداز سے اور کس محل پر آتا ہے۔ اوپر سے ذکر آسمان و زمین اور جمادات و نباتات، حیوانات کی پیدائش کا چلا آتا ہے۔ کہ اسی لپیٹ میں یہ تذکرہ بھی آجاتا ہے۔

"خداوند خدا نے زمین پر پانی نہ برسایا تھا اور آدم نہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے۔ اور زمین سے بخار اُٹھتا تھا اور تمام روئے زمین کو سیراب کرتا تھا۔ اور خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا۔ سو آدم جیتی جان ہوا۔" (پیدائش ۲: ۵-۷)

گویا جس طرح اور سب جانوروں کی نوعیں پیدا ہو رہی تھیں، ایک جاندار انسان نامی کی بھی نوع پیدا ہو گئی۔ اور اس سلسلہ کے بانی کا نام آدم رہا! اور گویا اس کا کام زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے، کہاں مادیت، حیوانیت کی یہ پستی اور کہاں نصب العین کی یہ بلندی، کہ انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔ اسے اپنے اعمال کے لئے جواب دہ اپنے خالق کے روبرو ہونا ہے پہلی بات تو لفظ خلیفہ کے تلفظ کے ساتھ ہی یہ سمجھ میں آئی۔ پھر اتنا ہی نہیں، وہ دوسروں کی بھی تکمیل کرے گا۔ اخلاقی، عقلی، روحانی اصلاح میں لگا رہے گا اور روئے زمین پر معدلت اور سیاست کی شریعت کا سکّہ چلائے گا۔ یہ سارا مفہوم ذرا سے لفظ "خلیفۃ اللہ" کے اندر شامل۔

پھر ایک اور گوشہ سے روشنی اس حقیقت پر ڈالئے۔ ایک اور زاویہ سے اسے جانچئے۔ ایک اور پیمانہ سے اسے ناپئے۔ آفرینش تو جس طرح آدم کی ہوئی ہے۔ اسی طرح آخر ساری مخلوق کی ہوئی ہے۔ جمادات و حیوانات کی بھی ملائکہ اور جنات کی بھی، عرش کی بھی، کرسی کی بھی۔ لیکن اور کسی کے بھی ارادہ تخلیق کا ذکر قرآن نے اہتمام کے ساتھ کیا ہے؟ یہ فخر تو صرف خلقت آدم کے

موضوع کو ملا۔ اور کیوں نہ ملتا؟ نائب السلطنت کا درود، اور عوام النّاس کی نقل و حرکت کہیں ایک درجہ کی چیزیں ہیں؟ ـــــ اللہ اللہ خاک کے پتلے کا یہ شرف و مرتبہ! مذاہب شرکیہ کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ انسان کے شرف و احترام کا یہ مقام، یہودیت نے کب جانا ہے؟ مسیحیت نے کب پہچانا ہے؟ اہل کتاب کی کتاب کا حوالہ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

اچھا اب پھر آجایئے اصل قصّہ کی طرف آدم (Vicegerent Designate) خلیفہ نامزد ہو چکے۔ اب فرشتے بلائے گئے۔ کہ وہی مخلوقات میں سب سے داناتر، عالم تر، کامل تر تھے۔ ارشاد ہوا کہ اچھا اشیائے کائنات کے خواص تو بیان کرو۔ نہ بیان کر سکے۔ کہ اس علم سے کورے تھے۔ اس علم سے کام انھیں پڑنے والا ہی نہ تھا ـــــ ذکر و شغل میں لگے رہنے والے صوفیوں اور زاہدوں کو حدیث کے نقد سے، رجال کی جرح سے، فقہ کے فتاویٰ سے قانون کے احکام سے آخر واسطہ ہی کیا؟ ـــــ اشارہ آدمؑ کو ہوا۔ آپ نے سبق فر فر سنا دیا۔ تسبیح و تقدیس کرتی رہنے والی معصوم مخلوق بے اختیار نعرہ لگا اٹھی۔

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ

پاک ہیں آپ اے ہمارے سرکار پاک ہیں اس سے کہ آپ کا کوئی بھی فعل حکمت سے خالی ہو، مصلحت سے عاری ہو ہمیں علم ہی کیا ہے؟ ہاں بس وہی تھوڑا بہت جو آپ ہی نے ہمیں عطا کر رکھا ہے۔ ہمارے علم جزئی کو آپکے علم کلّی سے نسبت کیا؟ حقیقۃً علم والے تو آپ ہیں کہ آپ کے لئے حاضر و غائب

قریب و بعید، ماضی و مستقبل سب یکساں عالم کل آپ ہیں ہر مخلوق کے ظرف کے، استعداد کے، صلاحیت طبع کے۔ اور حکمت والے بھی آپ ہی کہ بشر و ملک ہر مخلوق میں تقسیم علم اسی کے استعداد کے مطابق۔ اسی کے ظرف کے متناسب کر دی۔

یہ منظر برخاست۔ اب پردہ دوسرے منظر سے اٹھتا ہے۔ آدم کے سر پر اب خلافت الٰہی کا تاج ہے۔ حکم فرشتوں کو ملتا ہے کہ ہمارے اسی نائب کے آگے جھکو۔ نذرانۂ عقیدت اس کے سامنے پیش کرو اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ میں اسجدو اپنے لغوی معنی میں ہے۔ سَجَدَ اے خَضَعَ نماز کا اصطلاحی سجدہ مراد نہیں، نماز کے سجدہ کو بھی سجدہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ تذلّل و تواضع کا بہترین مظہر ہے اور پھر اہل تحقیق کی یہ تصریح بھی موجود ہے کہ لِاٰدَمَ میں حرف لام، معنی میں الیٰ یا سمت و جہت کے ہے۔ سجدہ آدم کو نہیں۔ صرف سمت آدم میں تھا، آج عالم اجسام میں، تکلیفات شرعیہ کے پورے ظہور کے وقت بھی۔ سجدہ کعبہ کو نہیں ربِ کعبہ کو کیا جاتا ہے۔ کعبہ صرف سمت ہے۔ کل اسی طرح عالم ارواح میں جب تکلیفات شرعیّہ کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ مسجود آدم نہیں۔ آدم آفرین ہی تھا۔ پیکر آدم صرف سمت سجدہ تھا۔

بہر حال حکم اظہارِ اطاعت کا فرشتوں کو ملا۔ اور جب فرشتوں کو ملا تو ظاہر ہے کہ ان سے ادنیٰ مخلوق کو پہلے ہی مل چکا۔ اور یہ بات ایسی کھلی ہوئی اور اتنی موٹی ہے کہ قرآن مجید نے اس کی صراحت ضروری نہ سمجھی (خیر حکم کی تعمیل سب نے کی۔ ایک نہ کی تو آگ کے بنے ہوئے ایک جن ابلیس نامی

نے۔ انانیت کی آگ سے جل کر بولا۔ "میں آتشی ہو کر خاکی کے آگے جھکوں ؟ ادنیٰ کے آگے اعلیٰ اپنے کو جھکائے گرائے ؟ ناممکن"! اپنی عقل پر نازاں، بے وقوف اتنا نہ سوچا۔ کہ خود اسی کی کیا دلیل ہے۔ عقلی یا نقلی۔ کہ آگ ہر حال میں خاک سے افضل ہی ہے اور بالفرض ہو بھی، تو یہ کس قاعدہ سے ثابت ہے کہ کسی خاص مصلحت سے یا کسی مخصوص حکمت کی بنا پر بھی بڑا چھوٹے کے آگے کسی حال میں نہ جھکے ؟ غرض اس منطق ابلیسی کے صغریٰ و کبریٰ دونوں غلط، نکالا گیا ملاءِ اعلیٰ سے پھینکا گیا آسمان سے۔ حکم کی نافرمانی کی علت میں۔ حکم بھی کس کا ؟ حاکم برحق کا، حکیم مطلق کا۔

ابلیس نکلنے کو تو نکلا۔ لیکن اکڑ کے ساتھ۔ اکڑ وہی جس کا نام آج کی ادبی بولی میں "پندارِ تفوق" ہے۔ کہتا ہوا نکلا کہ "میں تو جا رہا ہوں لیکن اپنے ساتھ اور بھی تیرے بہت سے بندوں کو لے مروں گا"۔ ارشاد ہوا۔ چل دور ہو۔ جو تیری راہ چلنا چاہیں گے وہ اپنا کیا ہوا خود ہی بھگتیں گے۔ باقی جو لوگ اپنے ارادہ واختیار سے صحیح کام لیتے رہیں گے اور ہمارے نازل کئے ہوئے پیمبروں کی راہ پر قائم رہیں گے۔ ان پر تیرا جادو کچھ بھی نہ چل سکے گا۔ تیرے پاس قوت ہی کیا ہے بجز وسوسہ اندازی کے"۔ ادھر یہ ہوا، ادھر آدم مع اپنی صاحبہ حوّا کے مزے چین سے جنّت میں رہنے بسنے لگے۔ ممانعت صرف ایک خاص درخت کے پاس جانے کی تھی۔

دونوں غافل و بے خبر اسی عیش میں تھے کہ موقع مل گیا ابلیس کو وار کرنے کا۔ ابلیس کا صفاتی نام اب شیطان تھا۔ پٹی ایک روز یہ پڑھائی

کہ "مزے سے جائیے آئیے ناں اس درخت کے پاس۔ وہ ممانعت جو ہوئی تھی وہ تو عارضی تھی۔ اس وقت آپ کے قویٰ میں پختگی نہیں آئی تھی۔ اب آپ ہر طرح پختہ ہو چکے۔ جائیے اور بے تکلف کھائیے پھل اس درخت کے اور سنئے کان ادھر لائیے۔ بات کان میں کہنے کی ہے۔ اس پھل میں تاثیر یہ ہے کہ ایک بار زبان پر رکھ لیجئے تو بس سمجھئے کہ ہمیشہ ہمیش کے لئے جنّت کے ہو گئے بس یہیں جم گئے۔ آپ کو میری بات کا اور میری خیر خواہی کا یقین کیوں آنے لگا تو لیجئے میں قسم کھا کر کہتا ہوں اپنے اور آپ کے پروردگار کی۔ اور آپ تو عاشق ٹھہرے ان کے نام کے"۔

محبوب کا نام سن کر عاشق پھسل پڑا۔ اس کا طائرِ فکر یہاں تک پہنچ ہی نہ سکا۔ کہ اس کے محبوب کا نام کوئی بے وقعتی یا بے قدری کے ساتھ لے سکتا ہے حضرت آدم تو حریص ہی تھے دل وجان سے مقام قرب حق میں قیام کے۔ اِدھر ذہن ہی نہ گیا کہ کہنے والا ہے کون ؟ اور کس نیت سے یہ افسوں پھونک رہا ہے بس اس کے پھسلاوے میں آ پھل کھا بیٹھے۔ پھل کا کھانا نہ تھا۔ کہ عمل کے طبعی اثرات ظاہر ہونے لگے۔ برہنگی اب تک چھپی ہوئی تھی۔ اب ظاہر ہو گئی۔ اور گزری جو کچھ گزری۔ اب احساس غلطی کا ہوا۔ اور زور شروع ہوا توبہ کا، ندامت کا، استغفار کا۔ اس پر قصور معاف ہوا۔ مرتبۂ مقبولیت پر بحال ہوئے لیکن بہرحال طبعی اثرات، گناہ دھل جانے کے بعد بھی قانون تکوینی کے ماتحت ظہور کر ہی دیتے ہیں۔ سنکھیا کھا کر توبہ وندامت سے خودکشی کا گناہ ممکن ہے کہ معاف ہو جائے، لیکن جسم پر موت کے مادی اثرات تو طاری ہو کر ہی رہیں گے۔ جنّت

کی آب و ہوا کے ناموافق اور وہاں کی فضا کے لئے غیر مناسب و غیر صالح غذا کھا کر وہاں مزید قیام کی گنجائش نہ تھی حکم ہوا۔ "میاں بیوی دونوں زمین پر اتر جاؤ۔ اب وہیں تمھاری نسل رہے بسے گی۔ ہر ایک کے لئے ایک مقدار کی عمر مقرر ہوگی۔ اس کے بعد ہماری طرف واپس آنا ہوگا۔ وہاں ہماری ہدایتیں ہمارے قاصدوں کے ذریعہ سے پہنچتی رہیں گی۔ جو کوئی ہمارے قانون کے مطابق زندگی بسر کریگا وہ یہاں آکر ہر طرح آرام پائے گا ـــــ دنیا کھیتی ہے اور آخرت حاصل کشت"!

انھیں خدائی قاصدوں کا نام پیمبر پڑا۔ اور سب سے پہلے پیمبر حضرت آدم ہی ٹھہرے۔ وہی سب سے پہلے انسان بھی ہیں۔ جو زمین پر آئے اور وہی سب سے پہلے نبی ہیں۔ جو خدا کا قانون زمین پر لائے ـــــ آدم کا زمانہ تاریخ کی پیدائش سے قبل کا زمانہ ہے۔ اور ہمارا آسمانی نوشتہ ان کی زمینی زندگی کے متعلق بے نتیجہ تفصیلات میں نہیں پڑتا۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ وہ رُوئے زمین پر ملک سراندیپ میں آباد ہوئے۔ آج اسی کو سیلون کہتے ہیں۔ اہل فن کے قرائن و قیاسات یہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے انسانی آبادی کی بنیاد ملک عراق، یا دجلہ و فرات کے دوآبہ میں پڑی۔

اولادیں آپ کی حضرت حوّا کے بطن سے متعدد ہوئیں۔ توریت میں نام تین بیٹوں کا آتا ہے۔ قابیل۔ ہابیل۔ شیث۔ اور یہ حضرت شیث؈ آگے چل کر پیمبر بھی ہوئے۔ توریت ہی کی روایت ہے کہ آپ نے عمر ۹۳۰ سال کی پائی۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

نبی اول کی سرگزشت حیات ختم ہوگئی۔ قرآن مجید نے چند سبق جو اس

سادہ روداد حیات کے ذریعہ سے دیدئے ہیں۔ کچھ ضمناً اور کچھ مستقلاً وہ بجائے خود اس قابل ہیں کہ ایک نظر ان پر بھی ہوتی جائے۔ پہلی بصیرت تو یہ حاصل ہوتی ہے کہ انسان کی ہستی ذات باری سے بالکل جدا اور متمایز ہے۔ اور وہ ذات پاک اس سے بالکل منزّہ ہے کہ انسان اس کے ساتھ کوئی رشتۂ مشارکت یا مجانست کا رکھے۔ آدم بس آدم ہی تھے۔ خدا یا دیوتا۔ معبود اکبر یا معبود اصغر کسی معنیٰ میں بھی نہ تھے۔ لیکن یہ کیا بات ہوئی؟ کیا کسی نے انسان کو خدا یا جزو خدا بھی سمجھا ہے؟ جی ہاں اس دنیا میں ایسے دانشمند بھی آباد ہیں۔ قوموں کی قومیں مشرکوں کی ایسی گزر چکی ہیں۔ جن کے نزدیک انسان اول جو تھا، دیوتا ہی تھا۔ اب بھی قبیلہ در قبیلہ ایسے ہیں جو انسان کے جد اول کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں۔ قرآن نے آفرینش آدم کا قصّہ بیان کر کے اس مشرکانہ عقیدہ پر ضرب کاری لگادی۔ اور یہ تعلیم عام کردی کہ مخلوق اور خالق کے درمیان رشتہ داری کیسی؟ آدم اور آدم آفرین کے درمیان بجز وجود کوئی شے مشترک ہی نہیں۔

دوسری تعلیم یہ ملتی ہے کہ آدم خلق ہوئے ہیں۔ نیست سے ہست ہوئے ہیں۔ عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ یہ نہیں کہ پہلے سے کوئی مادہ موجود تھا۔ آدم؈ کا قالب اس سے ترکیب دے لیا گیا۔ نہ یہ کہ پہلے سے حیوانی نوعیں موجود تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ نوع کے سب سے ترقی یافتہ فرد کا نام آدم ٹھہرا دیا گیا۔ عقیدہ کی یہ دونوں گمراہیاں پہلے بھی عام رہ چکی ہیں۔ اور آج بھی خدا معلوم کتنے مشرک مزاج انھیں گمراہیوں کے شکار ہیں۔

تیسرا سبق یہ ملتا ہے کہ آدم اللہ کے عبد اور خلیفہ تھے۔ اس کے مظہر یا اوتار نہ تھے۔ قوانین تکوینی کے پابند، احکام شرعی کے مکلّف، بالکل اسی طرح جیسے آپ کے بعد سے سارے آدم زاد آج تک چلے آرہے ہیں۔ مشرک قوموں کے نزدیک، مشرکانہ مذہبوں کے نزدیک، انسانیت اور الوہیت گویا ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ فرق صرف اعلیٰ اور ادنیٰ کا ہے۔ قرآن نے شرک کی یہ ریڑھ کی ہڈی توڑ کر رکھ دی۔

چوتھی ضرب اس قصّہ نے ملائکہ پرستی پر لگادی۔ مشرک قومیں اپنے عقیدہ میں دیوتا انھیں ہستیوں کو کہتی تھیں۔ اور انھیں عالم میں متصرف اور کائنات کے مختلف شعبوں میں حاکم سمجھتی تھیں۔ اسلام نے آکر بتایا کہ قوتِ تصرف اور قدرت تو الگ رہی۔ ملائکہ کا علم بھی کامل نہیں، انسان کی طرح وہ بھی قیاس اور فراست ہی سے کام لے سکتے ہیں۔ اور انسان ہی کی طرح ان کا علم بھی خدائی تصحیح کا محتاج رہتا ہے۔

پانچواں علم یہ حاصل ہوا کہ بشر کی ہستی اپنے خالق کے مقابلہ میں اس سے بھی زیادہ حقیر و پست ہے جتنی آفتاب کے مقابلہ میں ذرہ کی ہوتی ہے تاہم مخلوقات میں بشر کا مرتبہ سب سے افضل، سب سے اعلیٰ ہے۔ یہاں تک کہ ملائکہ کو حکم ہوا ہے اس کی تعظیم کا۔ انسان کا جھکنا ملائکہ پرستی کی جانب، عناصر پرستی کی جانب، کواکب پرستی کی جانب، اصنام پرستی کی جانب، ذہن بشری کی پستی کا اور فہم انسانی کے انحطاط کا آخری نقطہ ہے۔

چھٹا پہلو یہ ہے کہ کوئی انسان بزرگ سے بزرگ بھی خطا و میلان

عصیان سے محفوظ نہیں۔ اجتہادی لغزشیں پیمبروں تک سے ممکن ہیں یہ اور بات ہے کہ جس کا تعلق اللہ سے جتنا زیادہ جڑا ہوا اور مضبوط ہوتا ہے، اسی نسبت سے جلد تر وہ سنبھل جاتا ہے اور نبی کو معصیت پر جمنے نہیں دیا جاتا۔

ساتویں بات یہ معلوم ہوئی کہ معصیت یا لغزش کے بعد توبہ کا دروازہ بالکل کھلا رہتا ہے اور اگر ندامت دل سے ہے تو اس داغ کو دُھلتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اور توبہ کے بعد مرتبۂ قبولیت پر بحالی ہوجاتی ہے۔

آٹھواں مسئلہ یہ حل ہوا کہ قبول توبہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ معصیت کے جسمانی و مادی اثرات بھی زائل ہوجائیں اور تکوینی و طبعی نتائج سے رہائی مل جائے۔

نواں سبق یہ حاصل ہوا، اسی قصّہ کے ضمنی قصۂ واقعۂ ہابیل سے، کہ محض بزرگ زادگی ہرگز کام نہیں آتی۔ قابیل حضرت آدمؑ کا آخر صلبی ہی بیٹا تھا۔ اپنی قوت ارادی کو صحیح مصرف میں نہ لایا۔ اختیار سے صحیح کام نہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قتل انسانی، برادرکشی جیسی خونی معصیت سے اپنے ہاتھ رنگین کیے۔

دسویں بات کام کی یہ معلوم ہوئی کہ آدمؑ و نسل آدمؑ اپنے خالق کی نظر میں ایک معزّز مخلوق ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ اس پر آیت ناطق ہے۔ نعوذ باللہ ایسا نہیں ہے کہ اللہ میاں انسان کو بنا کر پچھتائے ہوں اور افسوس کیا ہو کہ میں نے ناحق ایسی مخلوق بنا ڈالی۔

یہ مفروضہ کوئی موہوم نہیں۔ یہودیت جیسے قدیم و مستند اور مسیحیت جیسے عالمگیر، دونوں مذہبوں کی کتاب مقدس میں آج تک یہ لکھا چلا آرہا ہے۔

"خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا۔" (پیدائش، ۶:۶)

(۲) نوحؑ و سفینۂ نوحؑ

حضرت آدم پر اب فاتحہ خیر پڑھیے اور اُن کے بیٹوں، پوتوں سے نظر بچاتے ہوئے "سفینۂ" نوح تک پہنچ جائیے۔ حضرت نوح فرزند تھے لامک کے اور حسب روایت توریت آپ کا سلسلۂ نسب حضرت آدم تک دسویں پشت میں پہنچتا ہے۔ قرآن مجید نے آپ کی عمر نو سو پچاس سال کی بتائی ہے۔ اس وقت کے اوسط عمر کو دیکھتے ہوئے یہ حیرت انگیز بھی نہیں۔ اور آپ کا خاندان تو اپنی درازعمری کے لئے مشہور بھی تھا۔ آپ کے والد کی عمر ۷۷۷ سال کی ہوئی تھی۔ آپ کے دادا کی ۹۶۹ سال کی۔ اور اس سے اوپر کی پشتوں میں بجز ایک کے اور سب ہی کی عمر نو سو سال سے کچھ کم یا زائد ہی ہوئی ہے۔ توریت میں یہ ساری صراحتیں موجود ہیں۔ اور ان کی نفی پر کوئی ایک شہادت بھی موجود نہیں۔ آپ کا وطن وہی تھا جو اس وقت تک انسانیت کا وطن تھا یعنی دجلہ فرات کا دوآبہ۔ اب اسے عراق کہتے ہیں۔ پہلے کبھی کالڈیا یا کلدانیہ نام تھا۔ اور کبھی بابل یا Baby lonia

شمالی سرحدیں آرمینیا سے ملی ہوئیں۔ آدم کا خاندان اس وقت تک اتنا پھیلا ہوا کہاں سے ہو سکتا تھا، کہ سارے روئے زمین کو یا بڑے بڑے براعظموں کو گھیر لے کل دس ہی نسلیں تو انسان کے وجود میں آئے ہوئے ہوئی تھیں جتنی بھی انسانی آبادی تھی، سب کے لئے وہی عراق کا زرخیز علاقہ بہت تھا لیکن اب جنّت سے نکلے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ خو بُو وہاں کی کچھ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ روحانیت کی بلندیوں کی جگہ لے لی تھی مادیت کی پستیوں نے، زمینی رنگینیوں نے، شیطانی دلچسپیوں نے، بدعملی سے گزر کر نوبت بدعقیدگی تک پہنچی اور جو توحید کی منادی کرنے بھیجے گئے تھے وہ لگے خود دیویوں کے آگے جھکنے، دیوتاؤں کے آگے گرنے۔ آج دنیا میں ترقی و تمدن کا ایک بڑا معیار بت تراشی و مجسمہ سازی Sculpture ہے۔ عظمت و اقبال کا یہ پیمانہ آج سے پانچ ہزار سال قبل کی بھی "مہذب" دنیا میں رہ چکا ہے۔ نوح کی "مہذّب و متمدن" قوم نے اپنے بلند پایہ اسلاف کے، اپنے قومی (Heroes) کے مجسّمے بنائے کہ اُن سے اُن کے کارناموں کی یاد قائم رہیگی یادگاریں دیکھتے دیکھتے پرستش گاہیں بن گئیں اور بڑے بڑے ستارے اور بڑے بڑے پرند اور خدا معلوم خاک بلا اور کیا کیا، بے تکلف پُجنے لگے۔ خلیفۃ اللہ اپنے مرتبہ اور مقام کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔

نوح نے سمجھایا بجھایا۔ ڈرایا دھمکایا۔ ناصحوں کی اب کب سنی جاتی ہے جو اس وقت سنی جاتی۔ زبان نے کبھی زبان سے ہار مانی ہے؟ دلیل صحیح کے جواب میں کج بحثی، برہان عقلی و نقلی کے مقابلہ میں کٹھ حجتی۔ خیر اگر نوح کی

پکار کو سنی اَن سنی کرتے رہتے، جب بھی غنیمت تھا۔ ضد نے اور الٹی مخالفت پیدا کر دی کہ یہ کیسا تاریک خیال ہے۔ خواہ مخواہ حائل ہو رہا ہے ہماری روشن خیالیوں کی آزادیوں کی راہ میں۔ فتوے کفر و شرک کے لگا رہا ہے ہمارے آرٹ کے کمالات پر ہمارے لطیف جذبات پر۔ مخالفت نے عداوت کا رنگ پکڑا۔ اور اب اپنے اصلی دوست اور حقیقی خیرخواہ کے ساتھ وہ برتاؤ شروع ہوا جو کٹر دشمنوں، شدید بدخواہوں کے ساتھ کیا جاتا ہے ——— پیمبر بھی بشر ہی ہوتا ہے۔ بشر نے عاجز ہو کر، ہر تدبیر سے تھک کر، ہر کوشش سے مایوس ہو کر آخر دعا خالقِ بشر سے کی۔ جواب ملا کہ بحر عصیاں میں ڈوبی ہوئی قوم پانی کے عذاب سے ہلاک، طوفان سے غرق ہو کر رہے گی۔ تم اپنے اور اپنے والوں کے لئے سفینۂ نجات کی تیاریاں کرو۔

حضرات انبیاء کو آج کل کے "توکل پیشہ" نذر و نیاز کے منتظر، خانقاہ نشین مشائخ یا تکیہ داروں پر قیاس نہ کیا جائے۔ یہ حضرات بڑے باعمل بڑے مستعد، بڑے کارگزار ہوا کئے ہیں۔ جہاز سازی کے فن میں آپ اناڑی، انیلے نہ تھے، ایک خاصہ بڑا جہاز اوپر نیچے تین درجوں کا تیار کر لیا۔ توریت میں اسکی پیمائش تک دی ہوئی ہے۔

"اس کی لمبائی ۳۰۰ ہاتھ اور اس کی چوڑائی ۵۰ ہاتھ اور اسکی اونچائی ۳۰ ہاتھ کی۔" (پیدائش ۶ : ۱۵)

گو اتنا بڑا جہاز، جیسے آج مسافروں کے جہاز یا Liners برطانیہ اور امریکہ کے درمیان عموماً چلا کرتے ہیں۔ لیکن جس لفظ کا ترجمہ اُردو توریت

میں "ہاتھ" کیا گیا ہے۔ انگریزی میں اس کے لئے (cubit) آتا ہے اور (cubit) کا طول و عرض، عمق خود ہی گفتگو کی بڑی گنجائش رکھتا ہے اس لئے اوپر کی پیمائش کو قطعی نہ سمجھئے۔ بعض دوسری روایتوں میں اسکی دوگنی پیمائش ملتی ہے اگر اسے قبول کیا جائے تو سفینۂ نوح برطانیہ کے بڑے جہازوں کوئین میری (queen Marry) وغیرہ سے بھی کہیں بڑا ٹھہرتا ہے۔

بارش کے خالق کا حکم ہوا اور ادھر زمین کے سوتے اُبل پڑے، اُدھر بادلوں کے منہ کھل گئے۔ توریت کی روایت ہے کہ دن رات ۴۰ دن تک مینہہ کی جھڑی لگی رہی۔ زمین کے اندر سے جو پانی اُبلا اس کا حساب ہی نہیں، جل تھل بھر گئے۔ پانی اونچا ہوا۔ سروں سے اونچا ہوا۔ گھروں سے اونچا ہوا، درختوں کو چھالیا، حد یہ ہے کہ پہاڑوں کو ڈھانپ لیا۔ سفینۂ نوح، کہتے ہیں کہ پانچ مہینے تک یا بہ الفاظ توریت ۱۵۰ دن تک سطح آب پر رواں رہا۔ وہی اس وقت دنیا کے پردہ پر ایک نجات گھر تھا۔ جو اس میں سوار ہوا بچ گیا۔ جو باہر رہا ڈوب مرا۔ راہ میں نوحؑ کو اپنا لڑکا کنعان نظر پڑا۔ پیرتا ہوا، سطح آب کو چیرتا ہوا، کسی طرف کو نکلا جا رہا ہے۔ آواز دی۔ "جانِ پدر! یہ سیلاب کی موجیں نہیں۔ قہر الٰہی کی فوجیں ہیں۔ ہلاکت سے امن آج کہیں نہیں۔ پناہ صرف میرے سفینہ میں ہے۔" لڑکا باپ کی نسل سے تھا۔ باپ کے دین پر نہ تھا۔ قوت کے زعم اور پندار کے نشہ میں بڑھتا چلا گیا۔ محبّت سے بے چین باپ نے

دعا کی۔ کہ بارِ الٰہا! رحم مجھ سے تو وعدہ یہ ہو چکا ہے کہ میرے والے سب کے سب بچا لئے جائیں گے اور اس سے بڑھ کر میرا والا اور کون ہو سکتا ہے۔ جواب ملا کہ نوح! خبردار۔ وہ تم سے ہے پر تم پر نہیں پڑا۔ وہ تمھارا والا ہے کب؟ تمھارے والے تو وہ ہیں جو تم پر ایمان رکھتے ہیں۔" یہ ارشاد ہوا اور مومن باپ کی آنکھوں کے سامنے کافر بیٹا غریق رحمت ہونے کے بجائے غریق لعنت ہو کر رہا۔

عذاب الٰہی کی بے پناہی، معاذاللہ! جب چاہیں پانی سے آگ کا کام لے لیں، اور جو زندگی کا سہارا ہے، اسی کو ہلاکت کا واسطہ بنا دیں۔ پانی جس کے حکم سے برساتھا اور اُبلا تھا بالآخر اسی کا حکم پہنچا آسمان کو کہ بارش تھم جائے اور زمین کو کہ پھر سے خشک ہو جائے۔ معاً تعمیل ہوئی اور کشتی کوہستان اراراط کی ایک چوٹی جبل جودی پر جا ٹھہری۔ توریت میں ہے کہ کشتی اراراط کے پہاڑوں پر ٹک گئی۔ اور توریت کے شارحین کا کہنا ہے کہ توریت کا یہ حوالہ تو مبہم (Indefinite) سا ہے (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۲: صہ ۴۷) عرب کے امی کی لائی ہوئی کتاب نے اس ابہام کو صاف کر دیا۔ متعین طور پر نام جودی کا لے دیا۔ اور آج بیان، قرآن کے مفسروں کا نہیں بائبل کے علماء کا یہ ہے کہ پڑوس کے رہنے والے اور مقامی واقفیت رکھنے والے کُردوں کا خیال کشتی کے رکنے کے مقام کے لئے اسی (جودی) کا ہے۔" (ہیسٹنگز، ڈکشنری آف دی بائبل، جلد اول صہ ۱۴۰)

اور انھیں کی زبان یہ گواہی بھی دے رہی ہے کہ۔

"شہادت اس کی موجود ہے کہ جس پہاڑی پر کشتی رکی تھی وہ جبل جودی ہی ہے۔ جھیل (Van) کے جنوب ومغرب میں۔"
(انسائیکلوپیڈیا ببلیکا۔ کالم۔ ۲۹)

ایک زمانہ تھا۔ اور اسے ابھی بہت روز نہیں ہوئے ہیں کہ طوفان نوح کا نام زبان پر لانا "روشن خیالی" کو تمسخر واستہزاء کی دعوت دینا تھا۔ پر اللہ کا کرنا کہ انیسویں صدی کی "روشن خیالی" اس بیسویں صدی میں خود قابل مضحکہ ٹھہر گئی۔ اور جو زبانیں فرشتوں کی لائی ہوئی وحی کی تکذیب وانکار پر دلیر تھیں انھیں گنگ ہو جانا پڑا۔ زمین والوں کی شہادتیں سن سن کر اور

طبقات الارض (جیالوجی) اور اثریات (آرکیالوجی) والوں کے بیانات پڑھ پڑھ کر کل تک انکار طوفان عظیم کے نفس وقوع سے تھا۔ آج مشہور ومعروف ماہر اثریات سر لیونارڈ وولی (Woolley) کہتے ہیں۔

"اُور کی سرزمین سے معقول شہادت اس کے وقوع کی بہم پہنچ گئی ہے سیلاب بہت وسیع تھا لیکن مقامی تھا۔" (وولی کی ابراہام صـ۱۴)

"اُور" علاقہ عراق کا قدیم مشہور شہر تھا۔ گویا طوفان کا نفس وقوع اور بہت بڑے پیمانہ پر وقوع سائنس کے اس نمائندہ کو بالکل تسلیم ہے دوسرے محقق سر چارلس مارسٹن لکھتے ہیں:۔

"اثری تحقیقات نے طوفان کے وقوع کو ثابت کر دیا ہے۔"

اور ویلنٹائین کی تازہ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے۔

"لینگڈن نے جو کھدائی شہر کش میں اور وولی نے شہر اُور میں ۱۹۲۹ء میں کی۔ اس نے ایک عظیم الشان اور بے مثال طوفان کے وقوع کو قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے۔" (صـ۲۲۶)

ایک نہیں متعدد شہادتیں آپ نے سائنس کی زبان سے سن لیں۔ اب صرف تعین باقی رہ جاتا ہے وقت اور مقام کا، مکان اور زمان کا۔ توریت کے نسخہ سبعینہ (Septugint Version) کا جو ترجمہ عبرانی سے یونانی میں کوئی تین سو سال قبل مسیح ہوا تھا۔ اس کے حوالہ سے مشہور ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کی پیدائش سنہ ۱۰۷۲ طوفانی میں ہوئی تھی۔ اور حضرت ابراہیم کی تاریخ ولادت سنہ قبل ولادت مسیح کے حساب سے معلوم ہے، اس حساب سے طوفان کی تاریخ تقریباً سنہ ۳۲۰۰ ق م قرار پائی ہے۔ یعنی آج سے سمجھئے کوئی ۵۱۴۲[2] سال قبل۔ بعض اور تخمینے اور روایتیں سنہ ۲۴۰۰ ق م سے متعلق بھی ہیں۔

طوفان کی عالمگیری کی مدعی بائبل ہو تو ہو۔ قرآن مجید کا یہ دعویٰ نہیں قرآن تو صرف یہ کہتا ہے کہ نوح کی امت دعوت یعنی بدکاروں نافرمانوں کی ساری قوم کی قوم ڈبو دی گئی۔ اور وہ قوم عراق عرب اور نواح آرمینیا کے علاقوں میں آباد تھی۔ طوفان بہ طور عذاب تھا اور عذاب ظاہر ہے کہ صرف نافرمانوں پر ہی

---

[1] اس ترجمہ میں ستر یا بہتر علماء وماہرین شریک تھے۔

[2] سنہ ۱۹۵۲ء میں ۵۱۵۲ سال۔

آتا ہے۔ اس لئے اگر آج پانچ ہزار سال قبل کے دریائی جانوروں کے ڈھانچے اہل فن کو صرف ارارط کی چوٹیوں پر نظر آئے ہیں اور سائیریا کے برفستان میں یا راجپوتانہ کے ریگستان میں نظر نہیں آئے ہیں تو اس سے ضرر قرآن کریم کے کسی دعویٰ کو شمہ برابر بھی نہیں۔ یہاں تک کہ لفٹنٹ کرنل (Wagslaff) کے خیال کے مطابق طوفانی علاقہ کا رقبہ اگر صرف ۴۰۰ میل طول میں اور ۱۰۰ میل عرض میں ثابت ہے جب بھی مطلق مضائقہ نہیں۔ وہ قوم بس اتنے ہی رقبہ میں آباد ہوگی ـــــ البتہ ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ خود نسل آدم کی آبادی بھی تو اس وقت اسی خطہ تک محدود تھی۔ اور انسان کا خاندان اس کے آگے پھیلا ہی نہ تھا۔ اس لئے سچ کہا ہمارے مفسروں اور محدثوں میں سے جس نے بھی کہا کہ طوفان نوح نے سارے عالم انسانی کو غرق کر دیا۔

حدیث میں نوح کے لئے لفظ اول المرسل کا آیا ہے۔ یعنی آپ دنیا کے سب سے پہلے رسول تھے۔ نبی کہتے ہیں ہر صاحب وحی کو (وحی لفظی معنی میں نہیں اصطلاحی معنی میں) اور رسول کے لئے ضروری ہے کہ صاحب وحی ہونے کے ساتھ ہی صاحب شریعت بھی ہو۔

حضرت آدمؑ کے وقت میں تمدن اپنی انتہائی سادہ شکل میں تھا احکام بھی وقت کے مناسب حال ویسے ہی سادہ۔ مستقل شریعت کی مفصل و مکمل احکام کی ضرورت تو حضرت نوح کے زمانہ سے پڑی۔ اور آپ پہلی شریعت لیکر آئے اور اب جو انسانی آبادی ہے، آپ ہی کی نسل سے ہے۔

حکمتیں، عبرتیں، بصیرتیں آپ کے قصہ میں بہت سی ہیں۔ سب کو سمیٹنے

اگر بن نہیں پڑتا تو سب کو چھوڑتے بھی نہیں بنتا۔

پہلی بات یہ ہے کہ پتھر میں جونک جس طرح مادی دنیا میں نہیں لگتی روح و اخلاق کی دنیا میں بھی نہیں لگتی۔ انبیاء سے بڑھ کر پُراثر تبلیغ اور مخلصانہ کوشش کس کی ہو سکتی ہے۔ لیکن مخاطبین کے دل جب فسق عملی و اعتقادی کی کثرت و شدت سے پتھر بن جائیں، تو ہر آواز ایسے کانوں کے لئے بے کار رہتی ہے۔

حضرت نوح کو تبلیغ کے لئے مدت کتنی وسیع ملی۔ لیکن سننے والوں کو اپنی اصلاح منظور نہ ہوئی۔ اس لئے پیمبر کی بھی ساری کوششیں بے اثر رہیں۔ انسان خود جب تک قبول حق کے لئے نہ تیار ہو۔ ناصح کی ہر تبلیغ گویا چکنے گھڑے پر پانی کا پڑنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ غفلت و انکار کے لئے مہلت ملتی ہے۔ لیکن وہ مہلت بھی غیر محدود نہیں ہوتی۔ ایک مدت موعود کے بعد عذاب الٰہی کے حرکت میں آنے کا وقت آجاتا ہے۔ یہ وقت موعود، فرد و جماعت دونوں کے ڈرنے کی چیز ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کا پاسپورٹ (پروانہ راہداری) نسل و خاندان نہیں، ایمان و عمل ہے۔ کنعان سے بڑھ کر بزرگ زادہ اور کون ہوگا؟ پیرزادہ، مرشد زادہ، شیخ زادہ نہیں پیمبر زادہ تھا۔ لیکن جب قابیل کی طرح نافرمانی پر تل گیا۔ تو سابقہ اسی قانون سے پڑا جو ہر آدم زاد کے لئے رکھ دیا گیا ہے۔ ہلاکت سے نہ کوئی مادی تدبیر بچا

سکی، نہ کوئی نسبی قرابت۔

چوتھا سبق یہ ہاتھ آیا کہ اس عالم اسباب میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے پردہ اسباب ظاہری کا رکھا جاتا ہے۔ نوح وآلِ نوح کو طوفان سے بچا لیا گیا، تو سفینۂ نوح ہی کے واسطہ سے۔

پانچویں تعلیم یہ حاصل ہوئی کہ پیمبر اپنے علم میں، قدرت میں، اختیار میں، بشریت کے حدود سے سرمو باہر نہیں ہوتا۔ حضرت نوح کا اتنا بھی بس نہ چلا کہ اپنے ڈوبتے ہوئے فرزند ہی کو بچا لیتے۔ یا اسے ایمان لانے پر مجبور کر چھوڑتے۔ اور یہ تو خیر پھر دور کی چیزیں ہیں۔ آپ کو اس کے انجام کا علم تک قبل سے نہ ہو سکا۔

(۳) ابراہیم خلیلؑ

داستان نوح ختم ہوئی۔ اب دنیا از سرِ نو آباد ہے۔ آپ کی اولاد کا سلسلہ چل رہا ہے، پھیل رہا ہے، بڑھ رہا ہے۔ ہدایت اور ضلالت دونوں کے سلسلے جاری ہیں۔ نئے نئے ملک آباد ہو چکے ہیں۔ قومیں بن چکی ہیں اور بگڑ چکی ہیں۔ گر چکی ہیں اور اُبھر چکی ہیں۔ حضرت ادریسؑ اور ان کی تعلیمات۔ حضرت ہودؑ اور ان کی اُمت قوم عاد، حضرت صالحؑ اور ان کی امت قوم ثمود۔ یہ سب عنوانات دلچسپ بھی ہو سکتے تھے اور سبق آموز بھی لیکن آج کی مختصر و سرسری صحبت میں اتنی گنجائش کہاں ہے، تاریخ مسلسل کے ان سارے درمیانی اوراق کو اُلٹ جائیے۔ اور اب نبی محترم ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ کے دور میں آجائیے۔

جہل و بے خبری بھی عجیب چیز ہے اور دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جو وحی کے منکر ہوتے ہیں، وہ خود علم و عقل کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ زیادہ نہیں چالیس ہی پچاس برس پہلے کی بات ہے کہ "روشن خیالی" نے حضرت ابراہیمؑ کے وجود ہی سے انکار کر دیا تھا اور یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ "اس نام کی کوئی

شخصیت ہی نہیں گزری ہے۔ اور یہ نام تو نوعی نام شیخ قبیلہ کا ہے۔"

حضرت ابراہیمؑ یہود و مسیحی دونوں قوموں کے مستند پیمبر اور مسلّم امام ہیں، ان دونوں کے "عقلیت زدہ روشن خیالوں" نے بے تامّل اپنی محققانہ کتابوں میں، اپنی انسائیکلو پیڈیاؤں میں یہی رنگ قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور کچھ عجب نہ تھا، کہ یہ بلا ہمارے ہاں بھی پہنچ جاتی کہ زمانے نے ایک اور کروٹ لی۔ تحقیقات کا رُخ بدلا اور زبردست اثری شہادتوں کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ ان کا وطن، ان کا مذہب یہ سارے نظریات پھر از سرِ نو حقائق بن گئے۔

آپ کی پیدائش قدیم کلدانیہ یا موجودہ عراق کے شہر اُور میں ہوئی شہر کا صرف نام اب تک توریت کے صفحات میں محفوظ تھا۔ نفس شہر جغرافیہ کے نقشوں سے مدت ہوئی غائب ہو چکا تھا۔ سینکڑوں نہیں، ہزاروں سال غائب رہنے کے بعد اب پھر نمودار ہو گیا ہے۔ کھدائی کے کام کی داغ بیل تو ۱۸۵۴ء ہی میں پڑ چکی تھی۔ ہوتے ہوتے آخر ۱۹۲۲ء میں جو زبردست اثری مہم برٹش میوزیم اور امریکہ کی (Pennsylvania) یونیورسٹی کے مشترکہ سرمایہ سے روانہ ہوئی۔ اس نے کھدائی کا کام برابر سات برس تک جاری رکھا اور اس کے خاتمہ پر دسمبر ۱۹۲۹ء میں اس مہم کے صدر سر لیونارڈ وولی (Woolley) نے ایک مستقل کتاب Ur of The Chaldeans کے نام سے لکھ دی۔

عراق کے محکمۂ آثار قدیمہ نے پورے شہر کو عجائب خانہ کے حکم میں لا کر اسے محفوظ کر دیا ہے۔ خلیج فارس کے ساحل سے شمال و مغرب کے رُخ پر دریائے فرات کے کنارے کنارے چلئے تو پایۂ تخت یعنی شہر بغداد ابھی آدھی دُور باقی ہو گا کہ آپ اُور کے محاذ میں پہنچ جائیں گے۔ اب دریا کا ساتھ چھوڑ کر جانب مغرب اور چلئے ½۸ میل پر بغداد بصرہ ریلوے لائن کو عبور کریں گے اور یہاں تک آپ کو جا بجا آبادی ملتی رہے گی۔ کہیں کہیں کھیتی باڑی اور کہیں کہیں کچے مکان اور جھونپڑے۔ آپ اسی سمت قدم بڑھائے چلئے اب بالکل ویرانہ شروع ہو جائے گا۔ دشت و میدان ایک ہو کا عالم۔ ڈیڑھ میل اور چلئے لیجئے اب آپ کے قدم اُور کے کھنڈروں پر پڑنے لگے۔

یہ تھا وہ مقام جو آپ کی ولادت سے مشرف ہوا۔ کسی زمانہ میں بڑا مقدس شہر تھا۔ آثار تمدن کثرت سے زمین کے تہ خانوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ توریت کی روایت ہے، کہ آپ کے اور حضرت نوحؑ کے درمیان دس پشتوں کا فرق ہے۔ یعنی آپؑ ان کی گیارہویں پشت میں ہیں۔ البتہ دوسرے قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توریت کے دئے ہوئے نسب نامہ میں کچھ پشتیں چھوٹ گئی ہیں۔ آپ کا سال ولادت سر چارلس مارسٹن کی جدید ترین تحقیق کے مطابق ۲۱۶۰ء ق۔م ہے، اور عمر شریف جیسا کہ توریت میں درج ہے۔ ۱۷۵ سال کی ہوئی۔ سنہ وفات اس حساب سے ۱۹۸۵ء ق۔م ٹھہرتا ہے۔

دنیا، متمدن دنیا، کا مذہب اس وقت بھی شرک کا تھا۔ حکومت کا مذہب مشرکانہ، قوم کے رسوم و آداب مشرکانہ۔ جس گھرانہ میں آپ نے آنکھیں کھولیں اس میں چرچا ہر طرف شرک۔ بت پرستی کا بھی اور کواکب پرستی کا

بھی۔ اصل معبود آسمان میں لٹکے ہوئے۔ ان کی مورتیں پتھروں کی کٹی اور تراشی ہوئی زمین پر مندروں کی رونق، دیوی دیوتاؤں کی مورتیں اس لئے کہ خود ان کی پوجا کی جائے، ان پر چڑھاوے چڑھائے جائیں۔

نبیؑ برحق کے والد کا نام تھا تارح یا عربی تلفظ میں آزر۔ نام کا تلفظ قدیم ماخذوں میں کئی کئی طرح آیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے آزر کافی ہے اپنے زمانہ کے بڑے صناع یا آرٹسٹ تھے۔ بے جان میں اپنی صنعت گری سے جان ڈال دیتے تھے۔ مورتیاں پتھر کی، اور شاید لکڑی کی بھی اس صناعی سے تراشتے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔

چراغ پہلے گھر میں جلتا ہے۔ بیٹے نے تبلیغ کی ابتدا رباپ ہی سے کی۔ بولے۔ "ابا جان! یہ آپ کو کیا ہوا ہے۔ آپ پوجا ان مورتیوں کی کرتے رہتے ہیں؟ انھیں پکاریئے تو سن نہ سکیں، کچھ دکھایئے تو انھیں سجھ بوجھ نہ پڑے، کسی کام میں ان کی مدد چاہئے تو آپ کے کام نہ آسکیں، صلاح میری مانئے۔ راہ میری اختیار کیجئے۔ مجھے وہ علم وہدایت کی روشنی مل چکی ہے جو آپ تک نہیں پہنچی ہے۔ ان شیطانی خرافات پر لعنت بھیجئے نہیں تو پھر آپ ہی بعد کو پچھتایئے گا۔"

باپ بگڑ کر بولے کہ "تو اپنے ہوش میں ہے؟ بدمذہب تو خود ہو چکا ہے اور چلا ہے الٹا مجھے نصیحت کرنے۔ بس رہنے دے اپنا وعظ۔ اپنی خیریت چاہتا ہے تو چپکا رہ، نہیں تو مارے پتھراؤ کے براحال کر دوں گا۔" سعادت شعار بیٹے نے جواب دیا کہ "خیر آپ کو اور آپ والوں کو تو چھوڑتا ہوں باقی آپکے

حق میں دعا جاری رکھوں گا۔"

قرآن، ابراہیمی زندگی کا ایک منظر اور دکھاتا ہے۔ آپنے ایک روز کیا کیا، کہ ایک تاروں بھری رات میں صحن میں آگئے۔ زحل اور مشتری، مریخ اور عطارد اور زہرہ یہ سب ہی پوجے جا چکے ہیں، اور اب بھی پُج رہے ہیں، انھیں میں سے یا کسی اور بڑے روشن تارے کی طرف نظر جما کر بولے کہ "ہو نہ ہو یہی تارا میرا دیوتا ہے۔ دیوتا بننے کی صلاحیت ہے تو اسی میں۔" رات کچھ اور بڑھی اور اسی کے ساتھ ساتھ تارا بھی کھسکا۔ آئیں! یہ کیا؟ یہ تارا بھی آزاد و خود مختار نہیں، کسی آئین میں جکڑا ہوا، کسی قانون کا پابند، کسی کے احکام کا محکوم ہے۔ اور لیجئے۔ روشنی بھی تو اس کی ماند پڑنے لگی۔ لاحول پڑھ آپ نے اُدھر سے منہ پھیرا۔ چاند نکلا اور رات کی اندھیریاں اُجالے سے بدلیں۔ آہا۔ یہ چندرماں دیوتا تو دنیائے شرک کے بڑے جانے پہچانے ہوئے ہیرو ہیں۔ قوموں کی قومیں ان کی خدائی کی قائل ہوئی ہیں اور واقعی انکی عظمت کا۔ ان کی نورانیت کا کیا ٹھکانا۔ مگر لیجئے یہ کیا؟ ارے یہ بھی تو لگے تاروں ہی کی طرح جھلملانے، سرکنے، اپنی جگہ چھوڑنے، اور رفتہ رفتہ بے نور ہونے! لاحول ولا قوۃ! یہ بھی کوئی خدائی ہے؟ یہ تو صاف نقشہ ہے بندگی کا، بے بسی کا، بے چارگی کا۔ چلئے چھوڑیئے انھیں بھی اب کی بھی کیسا دھوکا ہوا تھا لیکن اب دھوکا نہ ہوگا وہ دیکھئے نا۔ خسرو خاوری کا نور اقبال، ظہور اجلال! رات کی سیاہ چادر تو آمد آمد ہی سے کافور ہو گئی۔ یہ بے شک اس قابل ہے خدائی اس کی مانی جائے، اور اپنی

بندگی اور چاکری کی نسبت اس سے جوڑی جائے۔ ہندی اور جاپانی، مصری اور ایرانی، رومی و یونانی آخر سب ہی نے ان سورج دیوتا کو مانا ہے اور اپنے اپنے دھرم کا چراغ انھیں سے روشن کیا ہے۔ فکر و استدلال کی یہ کڑیوں پر کڑیاں ملتی جاتی تھیں۔ کہ لیجیے ادھر زوال آگیا، عروج کل دوپہر کا! عروج کے بعد زوال اور زوال کے بعد غروب! آئے دن کا مشاہدہ، اور زبان فطرت کا روزمرّہ! وہ جو بینائی کو خیرہ کر دینے والا نور مجسّم تھا۔ خلق کی نظر میں مکرّم تھا، معظّم تھا۔ لگا زرد رو مجرم کی طرح منھ چھپانے، افق کے دامن میں پناہ لینے، یہاں تک کہ بالکل غائب۔ پتہ نشان ڈھونڈھے بھی نہ ملے ــــ زبان حق ترجمان، شرک کے منظروں سے عاجز و پریشان بے ساختہ پکار اٹھی۔

يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝

اے میری قوم والو! تم جو کچھ اور جس کسی کو بھی خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، میں اس سے بری ہوں بیزار ہوں! کیسا آفتاب اور کہاں کا ماہتاب، میں نے اپنی لو لگائی ہے اس ہستی سے جو خالق ہے آسمان اور زمین کا (اور اُن سب پر حاکم و متصرّف) اور میں مشرکین کے دین سے بالکل تبرّی کرتا ہوں۔

ہو سکتا ہے (جیسا اکثر مفسّرین کا خیال ہے)، کہ یہ ماجرا ابراہیم کی کمسنی کا ہو، فطرت سلیم شروع ہی سے لیکر آئے تھے۔ آخر آگے چل کر نبی ہونے ہی والے

تھے۔ اور ہو سکتا ہے (جیسا قرآن کے لفظ یٰقوم، آپ کے تخاطب قوم سے متبادر ہوتا ہے) کہ آپ نے پیمبری کے بعد اس استدلال کا مظاہرہ قوم کے سامنے اس کی رہنمائی کے لئے کیا ہو۔

بہر حال اس کے بعد کی منزل وہ تھی جو پیش آنا ہی تھی۔ یعنی وَحَاجَّهٗ قَوْمُهٗ، مشرک قوم ٹوٹ پڑی موحّد پر، بحث و حجّت کے بجائے کج بحثی اور کٹھ حجتی کے لئے۔ ڈراوے اور دھمکیاں اس پر مستزاد۔ آپ نے فرمایا۔ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ۔ ارے تم چلے ہو توحید جیسی صاف صریح حقیقت میں مجھ سے بحث و جدال کرنے، اور پھر جب اللہ مجھے ہدایت سے سرفراز کر چکا! رہے تمھارے ڈراوے اور دھمکیاں، سو خدا کی شان کہ تم نہ ڈرو میرے طاقت و قوت والے ہمہ تواں خدا سے، اور میں ڈر جاؤں تمھارے بے طاقت ناتواں، خود ساختہ معبودوں سے!

قوم کی مخالفت اب زوروں پر ہے اور ابن آزر کی دعوتِ توحید و ردِّ شرک اب کوئی صیغۂ راز نہیں۔

ایک روز آپ کے دل میں آیا کہ ان بے وقوفوں کو سبق علانیہ دیجیے اور ان کی مشرکانہ حماقت کا اظہار ان پر برملا کیجیے۔ دن اُن کے میلہ کا آپڑا۔ میلے ٹھیلے تو مشرک قوموں کی زندگی کے جزو لاینفک ہیں۔ وہ میلہ تھا کہیں شہر سے باہر۔ چھوٹے بڑے سب کھنچے چلے جا رہے تھے۔ آپ نے ہانک پکار کر کہہ دیا، اور کسی کسی نے آپ کی آواز سن بھی لی۔ کہ "اچھا۔ جا تو رہے ہو۔ لیکن خدا کی قسم میں بھی تمھارے پیچھے تمھارے بتوں کی گت بنا کر رکھ دوں گا، تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ

اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ٥

اِدھر وہ گئے، اُدھر میدان خالی پا آپ ان کے دیوہرے میں گھس گئے اور ایک ہتھوڑی لے سب کو توڑ پھوڑ دیا، بجز بڑی مورتی کے کہ آخر تو تحقیق ہوگی ہی۔ اس وقت خوب موقع قائل کرنے کا ملے گا۔ (فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ)

میلہ واپس ہوا اور پجاریوں نے آکر اپنے معبودوں کی یہ گت بنی ہوئی دیکھی، ہل چل پڑگئی، لگے آپس میں کہنے، کہ یہ کس بے ادب، نالائق کی حرکت ہے؟ (قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ)

بعضے بعضے بول اٹھے کہ ہو نہ ہو حرکت اسی نوجوان ابراہیم نامی کی ہے سنا نہ تھا اس کو ہم نے، وہی تو ہمارے ٹھاکروں کی شان میں بے ادبی کے کلمہ بک رہا تھا (قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ) تلاش ہوئی اور آپ مجمع کے سامنے پکڑے آئے (قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ) پوچھ پاچھ آپ سے شروع ہوئی۔ (قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ) آپ تو اس موقع کی تاک ہی میں تھے۔ اس بڑے بُت کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ "جی اور کیا۔ کہیں یہ حرکت اُن بڑے صاحب کی تو نہیں۔ اِن سے پوچھ دیکھئے نا۔ بیان تو یہ بہرحال دے ہی سکتے ہوں گے ـــــ انداز بیان تمام تر طنزیہ۔ ایسے موقع کے لئے مناسب حال بھی، موثر بھی۔

مجمع ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے مشتعل بھی ہوا ہوگا اور منفعل بھی

توحید کے ایسے درس ابراہیم کے ہاں روز ہی ہوا کرتے تھے۔ قرآن مجید کے واسطے ان تبلیغی تقریروں اور خطبوں کے ٹکڑے محفوظ رہ گئے ہیں۔ کبھی آپ فرماتے کہ تمھاری عقلیں کیسی ماری گئی ہیں، اللہ کو چھوڑ چھاڑ تم کس کی پوجا میں لگے رہتے ہو؟ وہ جو نہ ذرہ بھر تمھیں نفع پہنچا سکے نہ نقصان۔ تف ہے تمھارے اوپر اور تمھارے بے بس معبودوں پر (اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْــًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ) اور کبھی جب دیکھتے کہ مخاطبین نے اچھا خاصہ ہجوم کر لیا ہے تو فرماتے، کہ اللہ تمھارا خالق، تمھاری ذات کا، صفات کا، افعال کا خالق پھر تمھاری عقلوں کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ جن مورتیوں کو اپنے ہاتھوں گڑھتے ہو، تراشتے ہو، انھیں کی لگ جاتے ہو پوجا کرنے۔ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ٥ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ٥ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ٥)۔

حضرت ابراہیمؑ کی نبوت کے، فضیلت کے، تقدس کے قائل جس طرح مسلمان ہیں۔ اسی طرح یہود اور مسیحی بھی ہیں۔ لیکن آپ کی زندگی کے دور عراقی میں آپ کی اس توحید پرستی اور آپ کی تذکیر و تبلیغ کے تذکرے صرف قرآن مجید ہی کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ باقی بائبل والوں کے ہاں تو گویا یہ موضوع کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔

بادشاہ کو پرچہ لگا، کہ ایک شخص اس عجیب و غریب عقیدۂ توحید کی تبلیغ اور سرکاری مذہب سے بغاوت کر رہا ہے۔ رعایا تو خیر مشرک ہی تھی، بادشاہ

سلامت چشمِ بد دور مرکز شرک! یعنی خود ہی سب سے بڑے دیوتا کے اوتار! رعایا سے اطاعت ہی کے نہیں، پرستش کے بھی طلب گار! مشرک قوموں کے ہاں یہ دستور انوکھا نہیں عام ہے۔ آپ دربار میں پہنچے، طلبی پر یا بلا طلب! (قرآن اپنے حکیمانہ اندازِ بیان کے مطابق یہ درمیانی غیر ضروری کڑیاں حذف کرتا جاتا ہے) اور بادشاہ سے دوبدو گفتگو شروع ہوئی۔ بادشاہ نے پوچھا۔ وہ کون ہے۔ آپ کا عجیب و غریب، اَن دیکھا پروردگار اور معبود! ذرا اس کے اوصاف تو سنوں؟ آپ نے فرمایا۔ ”ارے اس کے وصف تو آفتاب سے بڑھ کر روشن ہیں۔ سارے نظامِ کائنات کا وہی تو مالک و مختار ہے۔ موت و زندگی کا سارا کارخانہ اسی کے دستِ قدرت میں تو ہے، وہی جس کو چاہے جلائے وہی جس کو چاہے مارے“۔

مشرک بادشاہ کا دماغ ہی کتنا بے مغز آپ کے استدلال کے مغز تک نہ پہنچا۔ صرف ظاہری اور سطحی پہلو کو لے کر بولا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے، یہ تو میری قدرت کے تحت میں ہے۔ روز کیا ہی کرتا ہوں (قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ) جس کی چاہوں جان لے لوں جس کو چاہوں جان بخش دوں“۔ قرآن مجید میں بس اتنا ہی ہے روایاتِ تفسیری میں اتنا اور آتا ہے کہ قول اور عمل میں مطابقت پیدا کرنے کو اسی وقت اُس نے ایک خونی مجرم کی جان بخشی کر دی، اور ایک بے گناہ کو قتل بھی کرا دیا۔ بہرصورت جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ مخاطب اتنا نافہم ہے تو آپ نظامِ عالم سے جو استدلال کر رہے تھے اس کو آپ نے ایک آسان تر مثال میں پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا

خیر۔ یہ تو بتائیے کہ یہ آفتاب جو میرے اور اپنے سب کے پروردگار کے ہمہ گیر قانون کے مطابق روز سمتِ مشرق ہی سے طلوع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے بس میں ہے کہ اسکی رفتار کو گھما دیں اور آفتاب بجائے مشرق کے مغرب سے نکل آئے؟ (قَالَ اِبْرَاهِیْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ) یہ مثال اتنی عام فہم تھی کہ اس کے بھی سمجھ میں آگئی، جواب دے ہی کیا سکتا تھا؟ لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ قرآن کی بے نظیر منظر نگاری میں (فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ)

ان چند متفرق منظروں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کی عراقی زندگی توحید کی تبلیغ کے لئے وقف تھی۔ تبلیغ گھر والوں پر بھی باہر والوں پر بھی، عوام کو بھی خواص کو بھی، سربازار بھی، سردربار بھی۔ لیکن یہ دھیمی دھیمی آنچ کب تک جلتی۔ مخالفت کے شعلے بھڑکے اور عداوت کے شرارے بلند ہوئے حکومت کے مذہب (State Religion) کی تحقیر جمہور کے عقائد کی تردید کوئی معمولی بات ہوتی ہے؟ حکم ہوا کہ یہ ہمارے خداؤں کا دشمن ہمارے دیوتاؤں کا باغی یوں نہ مانے گا۔ ایک بڑا آتش کدہ تیار کرا کر اس میں اسے جھونک دو۔ جل بھن کر خاکستر ہو جائے۔ اس دورِ تمدن میں ایسی سزائیں شاذ نہیں عام تھیں۔

تیاریاں ہوئیں۔ سامان ہوئے۔ آپ آگ میں پھینکے گئے۔ لیکن جب آگ تک پہنچے تو لپکتے ہوئے شعلے آپ کے حق میں سبزہ و گلزار تھے۔ (قُلْنَا یٰنَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِیْمَ) آگ نام کسی فاعل

مختار کا نہیں۔ وہ بھی آخر کسی کے حکم ہی کے تابع ہے۔ اور جس کی تابع ہے اسی کا یہ حکم پہنچ چکا تھا کہ خبردار! کوئی گزند ابراہیم کو نہ پہنچنے پائے۔ سوز عشق میں ڈوبے ہوئے، آتش توحید میں تپے ہوئے آپ پہلے ہی سے تھے اس مادی آگ کی بھٹی میں پڑ کر اور نکھر گئے ـــــ امتحان وفا اتنا بڑا، اتنا کڑا، اور کس نے دیا؟ خلّت کے امتحان میں اس سے اچھے نمبروں میں اور کون پاس ہوا؟ خلیل اللہ کا لقب آپ کو نہ ملتا تو اور کس کو ملتا؟

حکمت الٰہی میں اب وقت آگیا تھا، کہ آپ وطن سے بے وطن ہوں اور اپنے ملک سے ہجرت کریں۔ اتنی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کے بعد آپ ملک میں رہ سکتے بھی کیوں کر تھے؟ چلے ہیں، تو ساتھ میں آپ کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ تھیں۔ اور آپ کے بھتیجے حضرت لوطؑ۔ اتنی کوششوں اور کاوشوں کا حاصل کل یہی دونوں ہی تھے۔ انھیں دو نے تو آپ کو سچا جانا تھا۔ شرک کو چھوڑ کر توحید کو مانا تھا۔ ہاں خادموں اور غلاموں کی پوری جماعت اگر ہمرکاب ہو تو کچھ عجب نہیں۔ آخر آپ شیخ القبیلہ بھی تو تھے اور توریت میں تصریح ہے کہ جانوروں، مویشیوں کے بہت سے گلّے آپ کے ساتھ تھے۔ بہرحال منزل در منزل سفر کرتے، راہ میں توحید کا درس دیتے اپنے مالک کی بڑائی پکارتے۔ آپ ملک شام میں پہنچے۔ اور پھر اس کے مغربی علاقہ میں آئے جو اب فلسطین کہلاتا ہے۔ توریت میں ہے کہ اس سفر کے وقت آپ کی عمر ۷۵ سال کی تھی۔ اور آپ کا سال ولادت اوپر گزر چکا ہے کہ ۲۱۶۰ء ق۔م تھا۔ اس حساب سے آپ فلسطین میں ۲۰۸۵ء ق۔م میں وارد ہوئے

جب وہاں قحط پڑا تو آپ مصر چلے آئے۔ یہاں کا بادشاہ آپ کا ہم نسب نکلا اور تجربہ کے بعد آپ کی ذاتی بزرگی کا بھی قائل ہو گیا۔ رخصت کے وقت علاوہ اور بیش قیمت تحفہ تحائف کے اس نے اپنی لڑکی کو بھی خدمت میں پیش کر دیا۔ زمانہ کے دستور کے مطابق یہ کہہ کر کہ "یہ کنیز آپ کی اور بڑی بیوی صاحبہ کی خدمت کے لئے حاضر ہے"۔ یہی شہزادی ہاجرہ آپ کی دوسری بیوی تھیں اور انھیں کو ناخدا ترس یہود نے آگے چل کر باندی یا لونڈی مشہور کر دیا۔ حضرت ہاجرہ کے فضائل اور وہ فضائل جو یہود کو مسلّم ہیں انکی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ان کا ذکر حضرت اسماعیل کے ذیل میں کبھی سنئے گا۔

حضرت کا سن اب ۸۵-۸۶ سال کا ہو چکا تھا۔ اس وقت کے اوسط عمر کے لحاظ سے یہ سن بڑھاپے کا نہ تھا۔ تاہم جوانی تو گزر ہی چکی تھی تمنّا آپ کو قدرةً پیدا ہوئی کہ اپنا جانشین صالح چھوڑ جائیں۔ دعا ان کی قبول ہوئی (رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ـ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ) ۲۰۷۴ء ق۔م انہی حرم ثانی سے صاحبزادہ ہوئے اور وہ اسمٰعیلؑ کہلائے۔

حضرت ابراہیم مصر سے عرب آچکے تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے مولد میں اختلاف ہے۔ مولد فلسطین ہو یا عرب؛ بہرحال اس قدر مسلّم ہے کہ جب حضرت اسمٰعیل قریب بلوغ کے پہنچ لئے۔ اور حضرت ابراہیم کا سن ۹۹ سال کا ہو چکا، تو اب خیال بڑی بیوی حضرت سارہ کو بھی اولاد کا ہوا، فرشتوں نے آکر بشارت دی، کہ اولاد ہو گی، چنانچہ حضرت اسحٰقؑ کی ولادت ہوئی۔ ان کا سال ولادت ۲۰۶۰ء ق۔م ہے۔ اب تک حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ میں خوب بن رہی

تھی۔ اور حضرت سارہ اپنا لڑکا حضرت اسمٰعیل ہی کو سمجھ رہی تھیں لیکن اب دونوں صاحب اولاد تھیں۔ حضرت ابراہیم اب آئندہ نباہ کے لئے یہی بہتر سمجھے کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو حضرت سارہ سے دور ملک عرب میں لاکر رکھیں۔ چنانچہ آپ نے یہی کیا اور اپنی بھی آمد و رفت برابر عرب میں جاری رکھی۔

زندگی کے عراقی دور اور فلسطینی دور کے بعد عربی دور آپ کی زندگی کا گزر رہا تھا، کہ آپ کو عالم رؤیا میں حکم ملا کہ اپنے اکلوتے فرزند کو خدا کی راہ میں قربان کردیں۔ یہ "اکلوتے بیٹے" کا لفظ قرآن کا نہیں خود توریت کا ہے۔ پیمبروں کے خواب بے معنی نہیں بامعنی ہوتے ہیں۔ قلب اتنا صاف ہوچکا ہوتا ہے کہ حواس ظاہری اور شعور کے تعطّل کی حالت میں بھی جو نقش اس لوح پر آکر جمتا ہے وہ باطل نہیں، صحیح ہی ہوتا ہے۔ صبح اُٹھ کر باپ نے بیٹے سے خواب بیان کیا اور بولے "خواب سن چکے۔ جانِ پدر! اپنی رائے بتاؤ"۔ دنیا کی تاریخ میں کیوں کسی باپ نے اپنے بیٹے اور اکلوتے لاڈلے بیٹے سے خود اسی کے قتل کے باب میں مشورہ کیا ہوگا؟ ___ ابراہیم جیسے شفیق ورحم دل اور رقیق القلب باپ نے نہ کبھی کسی شقی القلب اور بیدرد باپ نے بھی کیا ہوگا! لیکن بیٹا بھی کس باپ کا تھا اور کس نامور ترین انسان کا مورث اعلیٰ بننے والا تھا۔ جواب دیا بے جھجک اور بے دھڑک، کہ "ابا جان! حکم خداوندی کے بعد صلاح و مشورہ کیسا؟ کر گزریئے بے تامل جو کچھ آپ کو حکم ملا ہے۔ رہا میں تو اپنے اور آپ کے رب ہی کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ ثابت قدم

رہوں گا"۔ اب کیا تھا (قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ) بیابان میں باپ نے بلوغ پر پہنچنے والے اکلوتے بیٹے کو ذبح کے جانوروں کی طرح ہاتھ پاؤں باندھ کر لٹا دیا۔ چھری تیز کی۔ اور روایتوں میں آتا ہے کہ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھری بیٹے کے حلقوم پر چلائی، کہ وحی الٰہی کی آواز آئی، کہ ہوچکی آزمائش، ابراہیم ہوچکی۔ تم نے خواب کو سچ کر دکھایا، لو یہ مینڈھا اس کے بجائے ذبح کرو۔ تمہاری قربانی قبول ہوئی اور تمہاری یادگار سلام و رحمت کے ساتھ ہم نے آئندہ نسلوں میں چلا دی۔

چنانچہ آج مسلمان جو بے شمار جانوروں کی قربانیاں کرتے رہتے ہیں، روئے زمین کے گوشہ گوشہ میں اور اسلام کے عین مرکز میں ذی الحجہ کی دسویں اور گیارہویں اور بارہویں کو، یہ سب یادگار ہیں اسی "ذبح عظیم" کی!

یہی ذبیح اللہ جب ذرا اور بڑے ہوئے تو باپ اور بیٹے دونوں نے مل کر دنیا کے شرکستان میں خدائے واحد کی عبادت کا گھر تعمیر کیا۔ باپ کی نگاہ کشفی نے دیکھ لیا، کہ تجلیات جمالی وکمالی کا مرکز، بیت المعمور کے مقابل روئے زمین پر عرب کے ملک میں حجاز کے علاقہ میں وادئ مکّہ ہے، بیٹے کو ساتھ لئے، بغیر انجینئر اور معماروں اور مہندسوں کی مدد کے، ایک مربع نما مستطیل عمارت کھڑی کر دی۔ وہی عمارت کعبہ کہلاتی ہے۔ آج تک ہزارہا ہجی کا قبلہ، ہر توحید والے کا قبلہ۔ عمارت کیا بس ایک عظیم الشان کمرہ ہے۔ کوئی ۵، فٹ لمبا، ۶ فٹ چوڑا، اور ۸۰-۸۱ فٹ اونچا۔ اسمٰعیل کی عمر اس وقت

اگر ۲۰ سال کی فرض کی جائے تو اس بناء ابراہیمی کی تاریخ کوئی ۲۰۵۴ ق۔م قرار پاتی ہے۔ یعنی آج سے کوئی چار ہزار سال قبل۔ یہ محض تخمینہ ہے باقی اس بیت العتیق کی نفس قدامت اس کے مخالفین یہود ونصاریٰ تک کو تسلیم ہے۔

مزدوروں کو اکثر دیکھا ہوگا۔ جب کام کرتے جاتے ہیں تو کچھ گنگناتے بھی جاتے ہیں۔ اللہ کے گھر کے مزدور جس وقت اللہ کے گھر کی بنیادیں بھر رہے تھے دیواریں کھڑی کر رہے تھے تو یہ بھی اپنی زبانوں پر مُہر کئے ہوئے نہ تھے۔ جس کا گھر بنا رہے تھے، اسی سے کچھ مانگتے بھی جاتے تھے۔ ہاتھ مشغول تعمیر میں بیت کے اور دل یاد میں رب البیت کے۔ دل میں جس کی یاد زبان پر اس کا نام۔ بے آب وگیاہ سرزمین کی چلچلاتی دھوپ میں، دنیا کی کسی طمع کے بغیر۔ پتھر پر پتھر جوڑتے جاتے تھے اور دل کے سوز وگداز کے ساتھ تو یقیناً اور آنکھوں کی تراوٹ کے ساتھ غالباً زبانیں اسی ذکر میں مشغول تھیں۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔[1] اے ہمارے رب، ہم سے قبول فرما! ہماری یہ خدمت قبول فرما۔ بے شک تو ہی تو سننے والا (منہ سے نکلے ہوئے بولوں کا) ہے اور جاننے والا (دلوں کی نیتوں کا)" اللہ اللہ! یہ شان فنا ہوتی ہے۔ اللہ پر قربان ہونے والوں کی، اللہ کے خلیل کہلانے والوں کی! اپنے کو مٹا چکے ہیں، مٹا رہے ہیں، پھر بھی دھڑکا یہی لگا ہوا کہ دیکھئے، یہ اپنے کو مٹانا بھی قبول ہوتا ہے یا نہیں۔

[1] یہاں سے لیکر تین پیروں تک کا بیشتر حصہ ماخوذ ہے۔ راقم سطور کے سفر حجاز ص ۲۴۱ وص ۲۴۲ سے۔ (صدق جدید بک ایجنسی۔ کچہری روڈ۔ لکھنؤ)

دنیا کے کس مزدور نے وہ مزدوری مانگی جو بیت اللہ کے اس بڑے مزدور نے مانگی؟ کس نے وہ مزدوری پائی جو بیت اللہ کے اس بڑے مزدور کے حصہ میں آئی؟ مزدوری کی طلب، مزدوروں کو تنہا اپنے لئے نہ تھی۔ ہمارے لئے تھی۔ آپ کے لئے تھی۔ اُن سب کے لئے تھی جو اپنی کوئی بھی نماز بغیر اس مقدس مزدور پر درود وسلام بھیجے تمام نہیں کر سکتے ہیں۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار بنا لے، اپنا کر لے، اور ہماری اولاد سے ایک امت کی امت پیدا کر اپنی فرنبردار اپنی مسلم۔ ہمیں ہمارے حج کے اعمال بتا اور ہم پر رحمت سے توجہ فرما۔ بے شک تو ہی تو بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے (ماضی میں) اور بڑا مہربان (مستقبل میں) ابراہیم کی دعا کہیں خالی جا سکتی تھی؟ مزدور کو تو جو مزدوری ملی، اس کا حال وہ خود جانے، یا اس کا دینے والا، البتہ اس گھر کا طواف کرنے والوں کو اس کی طرف منہ کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے والوں کو اس کی محبت وعظمت کو دل میں جگہ دینے والوں کو کیا کچھ نہیں مل سکتا؟ کیا کچھ نہیں مل جاتا؟ کیا کچھ نہیں مل چکا ہے؟

گھر کی عزت اور عظمت کو، برکت ورحمت کو۔ سب ہی دیکھتے ہیں۔ دوست مانتے ہیں۔ دشمن صرف جانتے ہیں۔ کم لوگ یہ ذہن میں رکھتے ہیں کہ بنانے والے کا خمیر کس اخلاص وفنائیت کی مٹی سے ہوا تھا۔ روم کا مشہور و معروف عارف کہتا ہے ؎

کعبہ راکش ہر دمے عزت فزود   آں ز اخلاصات ابراہیم بود
فضل آن مسجد ز خاک و سنگ نیست   لیک در بناش حرص و جنگ نیست

اور بالکل سچ کہتا ہے، کہ کعبہ کی عزتوں اور فضیلتوں میں تم ہر لحظہ جو ترقی و برتری دیکھتے ہو۔ یہ ابراہیم ہی کے اخلاص و صدق نیت کا ثمرہ ہے وہی پتھر اور وہی مٹی۔ آخر ہر مسجد بلکہ ہر عمارت میں تو لگے ہوئے ہیں، انکے علاوہ اس میں کوئی اور نئی چیز نہیں۔ نئی چیز یہی ہے کہ اس کا بنانے والا نہ کوئی انجینئر تھا، نہ کوئی مہندس، نہ کوئی بادشاہ نہ امیر، بلکہ وہ تھا جو خودی کو یکسر مٹا چکا تھا۔ اپنے کو مٹا چکا تھا۔ اپنے کو تمام تر خدا کا بنا چکا تھا۔

تصوف کی ان لطافتوں سے اور ملاحتوں سے پھر آجائیے تاریخ کی ٹھوس خارجیت کی طرف۔ جامد واقعیت کی طرف، حضرت سارہ کی عمر جب ایک سو ستائیس ۱۲۷ سال کی ہوئی تو حسب روایت انھوں نے انتقال فرمایا اور ہبرون (Hebron) میں مدفون ہوئیں۔ اب اسی کو خلیل الرحمٰن یا صرف الخلیل کہتے ہیں۔ بیت المقدس سے کوئی ۲۰ میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب میں ایک چھوٹا سا شہر کوئی ۱۰ ہزار کی آبادی کا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ نے ایک اور شادی بی بی قطورہ کے ساتھ کی۔ ان سے چھ اولادیں ہوئیں اور اُن کی نسل سے ۱۶ قبیلہ چلے۔ قرآن نے جنھیں اصحاب مدین کہا ہے، وہ وہی لوگ تھے۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر جمیل اس کثرت سے اور اتنے موقعوں پر آیا ہے، کہ سب کو سمیٹنا اس مختصر صحبت میں ممکن نہیں احادیث اور تفسیری

روایات کا جو ذخیرہ ہے وہ اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ ہم نے امتحان لیا ابراہیم کا چند باتوں میں۔ وَاِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ وہ باتیں کون سی تھیں اور امتحان کی نوعیت کیا تھی، یہ تفصیلات درج ہیں۔ نہ ان کے معلوم ہونے کی ضرورت۔ سب امتحانات میں پورے اترے فَاَتَمَّهُنَّ انعام یہ ملا کہ عالم انسانیت کی امامت ان کے سپرد کر دی گئی۔ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ امامت بھی۔ اللہ اللہ کیسی امامت۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں سال گزر چکے۔ بابل و نینوا کا نام و نشان تک مٹ چکا۔ اور اہلِ توحید ہیں کہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہوں، نماز کی نیت جب باندھیں گے، منھ کریں گے، ابراہیم کے بنائے ہوئے کعبہ کی طرف۔ سالانہ قربانی جہاں کہیں پیش کریں گے حوالہ زبان پر ابراہیم کے نام کا لائیں گے (کما تقبلت من خلیلک ابراھیم) حج کرنے جائیں گے تو سجدہ کریں گے مقام ابراہیم پر۔ نماز کے آخر میں سلام و رحمت بھیجنے بیٹھتے ہیں تو نام اپنے رسول سے بھی پہلے لیتے ہیں ان کے انھیں جدِ مکرم کا۔ اور اکیلے اہلِ توحید ہی نہیں۔ یہود بھی اپنی بگڑی ہوئی توحید، اور مسیحی بھی اپنی برائے نام توحید کو لئے ہوئے کلمہ پڑھ رہے ہیں، دم بھر رہے ہیں۔ اللہ کے اسی برگزیدہ بندہ کا ــــ کوئی حد ہے انعام کی؟ اور کیوں نہ ہو؟ جب بندہ کی طرف سے کمی نہ ہو اخلاصات میں تو مولیٰ کی طرف سے کوئی کسر کیوں اٹھ رہے انعامات میں۔

حد یہ ہے کہ قرآن میں یہ آگیا ہے۔ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا۔

اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنالیا، خلیل کا ترجمہ دوست سے کرنا، خلت کے مرتبہ کو بہت ہلکا کردینا ہے۔ توریت میں بھی ایک نہیں دو مقامات پر لیکن دونوں جگہ ضمناً ابراہیم کو خدا کا دوست کہا ہے (یسعیاہ ۴۱، ۸ اور ۲ تواریخ ۲۰، ۷) اور اسی پر انجیل والوں کا بھی ایمان ہے ـــ خالق اپنے مخلوق کو قادر علی الاطلاق اپنے بندۂ محدود کو اپنا خلیل کہہ کر پکارے سرفرازیوں اور عزت افزائیوں کی بس انتہا ہے۔ خود قرآن ہی میں نہ آگیا ہوتا تو کوئی بندہ تو اپنی طرف سے ایسا لقب تراشنے کی جرأت بھی نہ کرسکتا۔ فیاضی مہمان نوازی، نرم دلی، شفقت خلق کی روایتوں اور حکایتوں سے یہودی اور اسلامی لٹریچر دونوں لبریز ہیں۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے قصہ کے ضمن میں تصریح ہے کہ فرشتے انسانی لباس میں آپ کے پاس آئے۔ آپکے لئے وہ اجنبی محض تھے۔ لیکن فوراً ہی آپ اُن کے سامان ضیافت میں لگ گئے۔

۱۹۸۵ ق م میں بیٹوں اور پوتوں کی موجودگی میں سکینت اور اطمینان کے ساتھ ۱۷۵ سال کی عمر میں جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ اور اب الخلیل کے بیرون حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف وغیرہم کے ساتھ زیر خاک آسودہ ہیں۔ یہ تربتیں ایک تہ خانہ کے اندر ہیں اور غار کا دروازہ بند ہے۔ ایک روایت مشہور یہ ہے کہ ترکوں کے عہد حکومت میں ایک ترک والئ شام نے فرط عقیدت سے اندر اُترنا چاہا۔ جانے کو تو چلا گیا لیکن باہر آیا تو اپنے حواس میں نہ تھا۔ کسی نے مجذوب قرار دیا۔ اور کسی نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ عالم برزخ کا کچھ حصہ مشاہدہ میں آگیا۔

تمت